وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ

ماہنامہ

میثاق

لاہور

سیرت نمبر

ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

مطابق فروری ۱۹۷۹ء

★

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶ - کے ، ماڈل ٹاؤن ، لاہور

فی پرچہ _____ چار روپے

وَقَدۡ اَخَذَ مِيثَاقَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُؤۡمِنِيۡنَ

ماہنامہ میثاق لاہور

عدد ۱-۲	جنوری، فروری ۱۹۷۹ء	جلد ۲۸

مشمولات

		صفحہ
★ تقدیم ...	ڈاکٹر اسرار احمد	۱
★ اسلام کی عیدین ...	" " "	۵
★ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت منتظم	" " "	۹
★ داعیانِ حق کو اساسی ہدایات (مطالعہ قرآن)	" " "	۱۷
★ بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم و بعثت موسوی علیہ السلام : ایک تقابلی مطالعہ	" " "	۳٦
★ قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا سید وصی مظہر ندوی	۴
★ انقلاب محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا استحکام	مولانا سید حامد میاں مد	۵۱
★ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مکارم اخلاق	پروفیسر حافظ احمد یار صاحب	٦۳
★ مقام محمد علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	٦۹
★ سیدنا بلال رضی اللہ عنہ ...	محمد یونس جنجوعہ	۸۱
★ امہات المومنین رضؓ (۲) ...	حکیم فیض عالم صدیقی	۸٦
★ سجدۂ تعظیمی ...	غازی عزیر (علی گڑھ)	۳
★ تعارف "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین رضؓ"	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۹
★ مرتبہ صدیقیت و سیرت صدیقی رضؓ	ڈاکٹر اسرار احمد	

پبلیشر : ڈاکٹر اسرار احمد   پرنٹر : چوہدری رشید احمد

مطبع : مکتبہ جدید پریس ، شارع فاطمہ جناح ، لاہور

مقام اشاعت : ۳٦ - کے ، ماڈل ٹاؤن - لاہور

(فون : 852683 - 852611)

فی شمارہ -/۲

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

اِس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ تاریخِ انسانی کا جو عظیم ترین، ہمہ گیر ترین اور صالح ترین انقلاب آج سے لگ بھگ چودہ سو سال قبل برپا ہوا تھا، اُس کے اساسی بنیادی عوامل دو ہی تھے —— ایک اللہ کی کتاب قرآنِ حکیم اور دوسرے اُس کے معلّم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم ——!!

اِن دونوں کے مابین نسبت و تعلّق کا معاملہ بڑا عجیب ہے، یعنی یہ کہ بظاہر یہ دونوں جُدا جُدا حقیقتیں ہیں لیکن بباطن: "من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جاں شدی!" کے مصداق ایک حقیقتِ واحدہ، یا زیادہ سے زیادہ یوں کہہ لیں کہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ یا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں! چنانچہ خواہ یوں کہہ لیا جائے کہ ؎

"اُتر کر حِرا سے سُوئے قوم آیا ⁂ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا!"

خواہ یہ کہ: ع "قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن!" بات ایک ہی ہے!!

یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے سورۂ بیّنہ میں "اَلْبَیِّنَہ" کی تشریح یوں کی کہ: "رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝" (البیّنہ: ۲) یعنی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم اور وہ انتہائی پاکیزہ صحیفے جن میں درج ہیں وہ تحریریں ہیں جو صاف اور سیدھی بھی ہیں اور قائم و دائم بھی، دونوں مل کر اس "البیّنہ" کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جس کے بعد حق و باطل گڈمڈ نہیں رہ سکتے، باطل کو لازماً حق سے جُدا ہونا پڑتا ہے!

قرآنِ حکیم کے ساتھ راقم الحروف کے ربط و تعلّق کی داستان یوں تو زیادہ طویل ہے اور اس کے تفصیلی ذکر کی یہاں کوئی حاجت نہیں۔ البتہ اس قدر عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ اوائل ۱۹۶۶ء سے اواخر ۱۹۷۱ء تک پانچ سال تو ایسے بیتے کہ مولٰنا حسرت موہانی مرحوم کے اس شعر کے مصداق کہ: ؎

"ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقّت بھی ⁂ اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی!"

کچھ مطب کی مشقت بھی چلتی رہی، لیکن اکثر و بیشتر توانائیاں خدمتِ قرآن ہی کیلئے وقف

رہیں۔ لیکن اس کے بعد پورے آٹھ سال ایسے بیت چکے ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ و بعونہٖ اس کام میں وہ یکسوئی حاصل ہے کہ دُوئی کا کہیں دُور دُور گذر نہیں! فَلَهُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّة

اگرچہ راقم الحروف پر اس سفر کے بالکل آغاز ہی میں وہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی تھی جسے غایتِ اختصار کے باوصف حد درجہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ ادا فرمایا ہے معلّمۂ اُمّت، صدیقۂ کبریٰ، اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اِن الفاظ میں کہ "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ ط" یعنی آپؐ کی سیرت قرآنِ پاک ہی ہے!!

چنانچہ اس عرصے کے دوران راقم الحروف نے لاتعداد مواقع و مقامات پر سیرت النبی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے موضوع پر تقاریر کیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسے 'درسِ قرآن' ہی کی طرح اپنا 'موضوع' بنائے ابھی راقم کو صرف ایک سال ہی ہوا ہے۔

تقریب اس کی یوں ہوئی کہ گذشتہ سال 'پاکستان سُنّی کونسل' نے خالق دینا ہال کراچی میں یکم تا بارہ ربیع الاوّل سیرت النبی کے موضوع پر ایک روزانہ نشست منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور کسی حُسنِ ظن کے باعث اس کے لئے مجھ سے استدعا کی گئی۔ میں اپنی لاہور کی مستقل مصروفیات کے باعث پورے بارہ دن تو نہ دے سکا، البتہ یکم تا چھ ربیع الاوّل مطابق دس تا پندرہ فروری ۸۷ء اور پھر ۹، ۱۰ ربیع الاوّل یعنی ۱۸، ۱۹ فروری کل آٹھ تقریریں راقم نے کیں جن میں نبوّت و رسالت سے متعلق بنیادی مضامین بھی زیرِ بحث آئے۔ حیاتِ طیبہ کے مختلف ادوار پر بھی روشنی ڈالی گئی، خلافتِ راشدہ بھی زیرِ بحث آئی، اور مسلمانوں کے عُروج و زوال کے ادوار کا ذکر بھی ہوا اور بالآخر ادھر توجّہ دلائی گئی کہ ہم مسلمان اس وقت کس مقام پر کھڑے ہیں اور سیرت النبی کی روشنی میں ہمارا فرضِ منصبی کیا ہے اور سیرتِ مُطہّرہؐ کی روشنی میں اس کی ادائیگی کے لئے لائحۂ عمل کون سا سامنے آتا ہے ——— اِن تقریروں سے سامعین کو تو کچھ حاصل ہوا یا نہیں، خود مجھ پر بعض حقائق روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئے۔ چنانچہ ایک طرف تو معلّمۂ اُمّتؓ کے متذکرہ بالا حکیمانہ قول کے معانی و مفہوم کے بھی دو پہلو سامنے آئے۔ یعنی یہ کہ قرآن اور سیرتِ رسولؐ باہم لازم و ملزوم ہیں اس اعتبار سے بھی کہ قرآنی تعلیمات کا پیکرِ مجسّم ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ——— گویا مصحفِ قرآنِ متلو ہے تو آنحضورؐ قرآنِ مجسّم ہیں ——— اور اس اعتبار سے بھی کہ اگر قرآن کو ترتیبِ نزولی سے مرتّب کر دیا جائے تو وہ سیرتِ رسولؐ بن جائے گا، گویا آنحضورؐ کی سوانح حیات بالخصوص آغازِ وحی سے متعلّا قبل سے لے کر حیاتِ دُنیوی کے آخری سانس تک کا مفصّل و مکمّل ریکارڈ بھی خود قرآن

ہی ہے۔ اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی منکشف ہوئی کہ اگرچہ دعوتِ دین کی اساس محکم تو درس و تدریس اور تعلیم و تعلّمِ قرآن ہی ہے لیکن خود قرآن کے افہام و تفہیم کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ سیرتُ النبیؐ کا صحیح اور واقعاتی بیان ہے۔ واللہ اعلم!

بہرحال کراچی کے اس پہلے تجربے کو راقم نے لاہور میں دوہرایا اور ۷۔اپریل تا ۹۔جون ۷۸ء ہر جمعہ کو بعد نمازِ مغرب ماڈل ٹاؤن لاہور کے دس[1] بلاکوں کی جامع مساجد میں دس تقریریں کیں جن میں شرکاء کی کثرتِ تعداد اور اُن کا ذوق و شوق یادگار رہے گا۔ ان دس تقریروں کے عنوانات حسبِ ذیل تھے:

۱۔ انبیاءِ کرام کی بعثت کا عمومی مقصد۔
۲۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کی انقلابی شان۔
۳۔ حیاتِ طیبہؐ کا مکّی دَور : دعوت، تنظیم، تربیت۔
۴۔ سیرتِ مطہرہؐ کا مدنی دَور : جہاد و قتال و تکمیلِ انقلاب۔
۵۔ رحمۃ للعالمینؐ کی عالمی بعثت : عالمی انقلاب کی تمہید۔
۶۔ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ : انقلابِ نبویؐ کا استحکام!
۷۔ خلافت حضراتِ عمرؓ و عثمانؓ : عالمی انقلاب کا سیلِ رَواں۔
۸۔ خلافتِ حضرات علیؓ و حسنؓ اور مسلمانوں کا باہمی جنگ و جدال!
۹۔ 'عام الجماعت' تا امروز : مسلمانوں کے عُروج و زوال کے دو دَور!
۱۰۔ بعثتِ نبویؐ اور اُمّتِ مُسلمہ کا فرضِ منصبی!

ماہِ نومبر ۷۸ء میں بعض احباب نے اصرار کیا کہ گذشتہ سال (۷۷ء) اس مہینے میں لاہور میں 'قرآن کانفرنس' ہوئی تھی، اِس سال 'قرآن کانفرنس' کراچی میں منعقد ہو چکی ہے تو کیوں نہ لاہور میں 'سیرت کانفرنس' منعقد کر لی جائے۔ چنانچہ انجمن کی مجلسِ منتظمہ نے فیصلہ کر لیا اور ۲۴ تا ۲۸ نومبر کل پانچ نشستوں کے انعقاد کا پروگرام طے ہوا لیکن افسوس کہ ہمیں عین آخری مرحلے پر ٹاؤن ہال (جناح ہال) کی اجازت صرف ایک دن کے لئے مل سکی۔ مجبوراً 'سیرت کانفرنس' کے تو صرف 'خلاصے' پر اکتفا کرنا پڑا ــــــ چنانچہ جُمعہ ۲۴ نومبر کو اس کی تین نشستیں ٹاؤن ہال میں منعقد ہوئیں۔ ایک صبح ۸½ تا ۱۲ بجے دن زیرِ صدارت مفتی محمد حسین نعیمی صاحب، دوسری عصر تا مغرب زیرِ صدارت مولٰینا عبید اللہ انور صاحب اور تیسری بعد مغرب زیرِ صدارت ڈاکٹر سلیم فارانی صاحب۔ البتہ اس ضمن میں جو کمی رہ گئی اس کی تلافی اس طرح کی گئی کہ مسجدِ شہداء میں ۲ تا ۵ دسمبر بعد

[1] ماڈل ٹاؤن کے 'H' بلاک میں اہلِ سُنّت کی کوئی مسجد نہیں ہے۔ صرف اہلِ تشیع کا مدرسہ 'باب المنتظر' ہے۔ بنابریں اس بلاک سے متعلق تقریر بلاک 'A' کی جامع مسجد میں ہوئی:

۷، ۸ دسمبر اور پھر ۱۴، ۱۵ دسمبر اور بالآخر ۲۲ دسمبر کو ۹ تقریروں میں راقم نے ان ہی موضوعات پر وسطِ شہر لاہور میں اظہارِ خیال کیا جن پہ ماڈل ٹاؤن میں کر چکا تھا۔ ٹیپ میں محفوظ تو کراچی والی تقاریر بھی ہو گئی تھیں اور ماڈل ٹاؤن والی بھی لیکن مسجد شہداء والی تقاریر کو انجمن نے اپنے اہتمام میں باقاعدہ ٹیپ کیا۔ اور اس خیال سے کہ ان تقاریر کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنے کا مرحلہ تو اللہ ہی جانے کب آئے فی الحال TAPES ہی کے ذریعے ان مضامین کو عام کیا جائے۔ مکتبۂ انجمن کے تحت کراچی میں شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے زیرِ اہتمام اُن کی نقول تیار ہو رہی ہیں ــــ (یہ ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹے کے گیارہ CASSETS ہوں گے جو بالکل لاگت قیمت پہ ڈھائی سو روپیہ فی سیٹ کے حساب سے مہیا کیے جا سکیں گے۔

۱۲ ربیع الاوّل کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یومِ ولادت باسعادت کی حیثیت سے "منانے" کا سلسلہ تو غالباً بہت پہلے سے ہے۔ البتہ اس کو باقاعدہ عیدُ میلادُ النبیؐ قرار دینے کا معاملہ ماضی قریب ہی سے متعلق ہے۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ایک 'بدعت' ہے اِس لئے کہ اسلام کی اصل عیدیں دو ہی ہیں ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ۔ یہ تیسری 'عید' ایک اضافہ ہے، جس کا کوئی ثبوت "قُرُوْنٌ مَشْهُوْدٌ لَهَا بِالْخَيْرِ" میں ہمیں نہیں ملتا۔ اب ستم بالائے ستم یہ کہ چونکہ یہ دورِ جمہوریت کا ہے اور اس میں "اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ!" کی حقیقت عکسی صورت اختیار کر چکی ہے یعنی "اَلْحُكَّامُ عَلٰى دِيْنِ الْعَوَامِ!" لہٰذا اس سال یہ عید غیر معمولی انتظام اور شان و شوکت کے ساتھ سرکاری اہتمام میں منائی جا رہی ہے!!

ہم اس موقع پر یہی کر سکتے ہیں کہ ایک تو اللہ سے دُعا کریں کہ وہ ہمارے عوام و خواص سب کو ہدایت دے اور اوہام و بدعات دونوں کے چکّر سے نکالے ــــ اور دوسرے یہ کہ اِس موقع پر لوگوں کی سوچ کے رُخ کو صحیح سمت میں موڑنے کی امکانی حد تک کوشش کریں ــــ چنانچہ اسی کی ایک حقیر سی کوشش ہے یہ 'سیرت نمبر' بھی اور متذکرہ بالا سلسلۂ تقاریر بھی ــــ اور خاص اس موضوع پر "نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلّق کی بنیادیں!" کے عنوان سے طبع شدہ ایک تقریر کی طبع ثالث بھی جو پہلے زیادہ حُسنِ طباعت سے مُزیّن ہے۔ (اس سے متعلق مفصّل اعلان کور کے آخری صفحے پر دیکھئے!) ــــ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ (نوٹ: 'عید' کے لفظ کی مناسبت سے راقم کی ایک تقریر بھی جو

اسلام کی دو سالانہ عیدیں

عید الفطر و عید الاضحیٰ

اور فقراء و مساکین کا لحاظ

ایک تقریر جو گزشتہ عید الفطر سے ایک روز قبل ریڈیو پاکستان لاہور سے نشر کی گئی

از : ڈاکٹر اسرار احمد

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

عید الفطر اور عید الاضحیٰ دونوں عیدیں دو عظیم عبادات اور اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے دو اہم ارکان کے ساتھ ملحق ہیں۔ یعنی عید الفطر صوم رمضان کے ساتھ اور عید الاضحیٰ حج بیت اللہ کے ساتھ ـــــ اور ان دونوں میں جہاں دوگانۂ شکرانہ مع اضافی تکبیرات اور نماز کے لئے جاتے اور آتے ہوئے غلغلہ تکبیر بلند کرتے رہنا مشترک ہیں، جس کا حکم قرآن میں بھی موجود ہے، چنانچہ صوم رمضان سے متعلق آیت کا اختتام بھی ان الفاظِ مبارکہ پر ہے: وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝ "اور تاکہ تم پوری کرو تعداد اور تکبیر کرو اللہ کی اس ہدایت پر جو اس نے تم کو دی اور تاکہ تم شکر کرو!" ـــــ اور سورۂ حج میں فرمایا: کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ "اور اس طرح اس نے ان قربانی کے جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا، تاکہ تم اللہ کی تکبیر کرو اس ہدایت پر جو اس نے تمہیں عطا فرمائی اور اے نبی! بشارت سنا دیجئے احسان کی روش اختیار کرنے والوں کو" ـــــ اسی طرح دونوں عیدوں کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے غرباء و فقراء اور محتاجوں اور مسکینوں کے لئے خاص اہتمام رکھا ہے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر تو ظاہر ہے کہ یہ ضرورت قربانی کے گوشت کے ذریعے پوری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ

سورۂ حج میں دوبارہ فرمایا کہ اس میں سے خود بھی کھاؤ اور غرباء و مساکین کو بھی کھلاؤ، چنانچہ پہلے فرمایا: "فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ" اور دوبارہ پھر فرمایا:— "فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ": یعنی کھاؤ اُس میں سے خود بھی اور کھلاؤ فاقہ کش فقیروں کو بھی"— اور کھاؤ اس میں سے خود بھی اور کھلاؤ ان قانع لوگوں کو بھی جو صاحبِ احتیاج ہونے کے باوجود صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں —— اور ان کو بھی جو بےتاب ہو کر دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

عید الفطر کے موقع پر اسی غرض کے تحت اسلام میں صدقۂ فطر کا حکم دیا گیا ہے تاکہ عید کی خوشیوں میں صاحبِ استطاعت لوگوں کے ساتھ غرباء و مساکین بھی شامل ہو جائیں۔ یہ صدقہ ہر اُس مسلمان پر واجب ہے جو صاحبِ نصاب ہو، اور پھر اُس کو وُسعت یہ دی گئی ہے کہ ایسا شخص صرف اپنی ہی طرف سے یہ صدقہ نہ کرے بلکہ اپنے زیرِ کفالت ہر ہر ذی نفس کی جانب سے ادا کرے۔ یہاں تک کہ ایک بچہ اگر عین عید کی صبح کو تولّد ہوا ہو تو اُس کی جانب سے بھی صدقۂ فطر ادا کرنا واجب ہے۔ صدقۂ فطر کا ذکر اگرچہ قرآن میں تو موجود نہیں ہے تاہم متعدد احادیثِ نبویّہ علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام میں اس کا ذکر نہایت وضاحت اور غایت درجہ تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ مثلاً بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ:

"عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال فرض رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم زکوٰۃ الفطر صاعًا من تمر اَوْ صاعًا مِنْ شعیرٍ علی العبد والحُرّ والذکر والانثیٰ والصغیر والکبیر من المسلمین وَ اَمَرَ بِهَا اَنْ تُؤَدّٰی قبل خروج النّاس اِلَی الصّلوٰۃ۔!

(یعنی حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپؓ نے فرمایا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مسلمانوں میں سے ہر غلام اور آزاد اور ہر مرد اور عورت اور ہر چھوٹے اور بڑے پر صدقۂ فطر لازم کیا ہے۔ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو، اور حکم دیا ہے کہ یہ صدقہ نمازِ عید کے لئے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے!)

اس حدیث میں اگرچہ اس بات کی صراحت نہیں ہے کہ یہ صدقۂ فطر صرف صاحبِ نصاب پر واجب ہے۔ لیکن یہ بات اظہر من الشّمس ہے اور عقلِ سلیم کے لئے اِس کا جاننا کچھ مشکل نہیں

اِس لئے اِس کی صراحت نہیں کی گئی۔ کھجوروں اور جَو کی وضاحت اس لئے کی گئی کہ یہی اہلِ مدینہ کی عام خوراک تھی۔ اور ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو سے ایک متوسّط افراد پر مشتمل کنبے کی ایک دن کی غذائی ضروریات کی کفالت ہوجاتی تھی۔ گویا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صاحبِ نصاب شخص کے گھر میں اگر کُل افراد دس ہیں تو اُس کے صدقۂ فطر سے غریب مسلمانوں کے دس گھرانوں کی ایک دن کی خوراک کا پُورا انتظام ہوگیا۔ صاع کے تعیّن میں کسی قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض علمار کے نزدیک وہ ہمارے اوزان کے اعتبار سے ساڑھے تین سیر کے لگ بھگ ہوتا ہے اور بعض کے نزدیک اس سے نصف یعنی پونے دو سیر کے لگ بھگ۔ اِس کے تعیّن کے لئے لوگوں کو اپنے معتمد علیہ علمار کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، اور چونکہ ہمارے یہاں کی عام خوراک گندم ہے لہٰذا ساڑھے تین سیر یا پونے دو سیر گندم کی جو قیمت بازار میں ہو اُس کے حساب سے ہر ہر فردِ خانہ کی جانب سے صدقۂ فطر ادا کرنا چاہیئے ـــــ صدقۂ فطر کی نمازِ عید کے لئے گھر سے روانگی سے قبل ادائیگی کی تاکید کی مصلحت بھی واضح ہے کہ اِس کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ غُرباء و مساکین بھی عید کی خوشیوں میں آسودگی کے ساتھ شریک ہوسکیں۔ ایسا نہ ہو کہ کسی مسلمان آبادی میں لوگ عید کی خوشیاں منا رہے ہوں جبکہ اسی آبادی میں کوئی مسلمان گھرانا فاقے سے ہو!

صدقۂ فطر کی اس حکمت کو اس روایت میں بیان کیا گیا ہے جو سُننِ ابی داؤد میں وارد ہوئی ہے ـــ یعنی:

عن ابن عبّاس رضی اللہ عنہما قال فرض رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم زکٰوۃ الفطر طُھرًا للصّیام مِن اللّغوِ و الرّفث وطُعمۃً للمساکین!

["حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے آپؓ نے فرمایا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صدقۂ فطر اس لئے واجب اور لازم کیا ہے کہ لوگوں کے روزے اگر فضول اور لایعنی گفتگو یا کسی فحش بات کے باعث آلودہ ہوگئے ہوں تو اس سے پاک ہوجائیں اور ساتھ ہی محتاجوں اور مسکینوں کے کھانے کا بندوبست ہوجائے!"]

ان دونوں احادیث میں صدقۂ فطر کے لئے زکٰوۃ الفطر کے الفاظ وارد ہوئے ہیں جس میں اصل اشارہ اسی جانب ہے کہ جس طرح فرض زکٰوۃ کا اصل حاصل بھی یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں سے مال کی محبّت کی نجاست کو دُور کردے تاکہ لوگوں کی سیرتوں اور شخصیتوں کی تعمیر ان خطوط

بقیہ صہ ۶۸ میں دیکھئے

فہرست مطبوعات

مرکزی انجمن خُدّامُ القُرآن لاہور

تصانیف امام حمیدُالدین فراہیؒ

مجموعہ تفاسیر فراہی	ہدیہ -/۲۴ روپے
اقسام القرآن	ہدیہ ۳/۷۵ "
ذبیح کون ہے ؟	ہدیہ ۴/۵۰ "

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

سلسلۂ تدبر قرآن

مبادیٔ تدبّرِ قرآن	ہدیہ -/۸ روپے
مقدمہ تدبّرِ قرآن و تفاسیر آیت اللہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ	ہدیہ -/۳ "
تدبّرِ قرآن جلد اوّل : از ابتداء تا سورۂ آل عمران	" -/۵۰ "
تدبّرِ قرآن جلد دوم : سورۂ نساء تا سورۂ اعراف	" -/۵۰ "
تدبّرِ قرآن جلد سوم : سورۂ انفال تا سورۂ بنی اسرائیل	" -/۵۰ "
تدبّرِ قرآن جلد چہارم : سورۂ کہف یا سورۂ قصص	" -/۵۰ "
حقیقتِ دین : مشتمل بر حقیقت شرک، حقیقت توحید، حقیقت تقویٰ، حقیقت نماز (زیرِ طبع)	
دعوت دین اور اس کا طریق کار	" -/۱۰ "
اقامت دین کے لیے انبیاء کرام کا طریق کار	" ۱/۲۵ "
قرآن اور پردہ	" -/۱ "
اسلامی قانون کی تدوین	" -/۵ "
اسلامی ریاست	" -/۲۰ "
پاکستانی عورت دوراہے	" -/۱۰ "

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت منتظم

از : ڈاکٹر اسرار احمد

ایک تقریر جو ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام "خیر البشرؐ" کے سلسلے میں ۲۲ر جنوری ۷۹ء کو ریکارڈ کی گئی اور ۷ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ کو نشر ہوئی!

احمدہٗ و اصلّی علیٰ رسولہ الکریم، امّا بعد، فاعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہمارا ایمان ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک نبی ہی نہیں "خاتم النبیین" ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں "آخر المرسلین" ہیں۔ اس طرح جہاں نفسِ نبوت ایک قدر مشترک ہے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور جملہ انبیاء و رسل کے مابین، وہاں ختمِ نبوت آپ کا وہ امتیازی وصف ہے جس میں کوئی دوسرا نبی یا رسول آپ کا شریک و ہمسر نہیں۔ گویا اس اعتبار سے آپ کی مبارک شخصیت میں اللہ تعالیٰ کی شانِ یکتائی کا ایک پرتو بتمام و کمال موجود ہے — مزید برآں آپؐ کی ذاتِ مبارکہ پر نبوت ختم ہی نہیں ہوئی مرتبۂ اتمام و اکمال کو بھی پہنچی ہے اور آپ کی ذاتِ والاصفات پر رسالت کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوا درجۂ تکمیل کو بھی پہنچا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس اٹل فیصلہ کا اظہار و اعلان کہ آپؐ پر نورِ نبوّت و رسالت کا اتمام و اکمال بھی ہو کر رہے گا اور نعمتِ شریعت و ہدایت کی تکمیل بھی، زبانِ وحی سے بار بار ہوتا رہا۔ جیسے سورۂ صف میں فرمایا: "وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ"! یعنی اللہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو — اور سورۂ توبہ میں فرمایا: وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ

يُتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْكَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ !" یعنی اللہ کو ہرگز منظور نہیں مگر یہ کہ وہ اپنے نُور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ مشرک کتنا ہی ناپسند کریں اور اس پر آخری مہر تصدیق ثبت کر دی اُس آیۂ مبارکہ نے جو عین حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی۔ یعنی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ" یعنی آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا۔ فللّٰہ الحمدُ والمنّۃ!!

اب اس پر غور فرمائیے کہ نفسِ نبوّت اور ختمِ نبوّت کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور بنا بریں آپؐ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں :

۱ : نفسِ نبوّت کی رعایت سے آپؐ شاہد بھی تھے اور بشیر و نذیر بھی، بلحوائے الفاظ قرآنی : "اِنَّآ ارسلنٰك شاهِدًا و مبشرًا و نذيرًا "۔ داعی بھی تھے اور مبلّغ و مذکّر بھی، ــــ اور مُعلّم بھی تھے اور مربّی و مزکّی بھی ــــ اور اس اعتبار سے آپؐ کی عظمت کا مظہرِ اتمّ وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو آپ کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے ذریعے تیّار ہوئے جنہیں ہم صحابہ کرام کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جن سے بہتر یا افضل کوئی جماعت اس زمین کی پُشت پر اور اس آسمان کے نیچے کبھی دیکھنے میں نہ آئی، رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھُم اجمعین!

۲ : اتمام واکمالِ نبوّت و رسالت کے مقاصد کی تکمیل کے اعتبار سے آپؐ نسلِ آدم کے عظیم ترین انقلابی رہنما، ہمہ گیر ترین اسلامی تحریک کے قائد، پاکیزہ ترین معاشرے اور عمدہ ترین تہذیب و ثقافت کے موسّس، بہترین نظامِ حکومت کے بانی اور عدل و انصاف کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی نظامِ معیشت کے قائم کرنے والے ہیں اور ان تمام حیثیتوں سے آپؐ کے کمالات کا مظہرِ جامع وہ نظامِ حیات ہے جو آپؐ نے نوعِ انسانی کو صرف نظری طور پر ہی عنایت نہیں فرمایا بلکہ اپنی بہترین عملی و انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے ایک وسیع و عریض خطۂ ارضی پر بالفعل قائم فرما دیا اور اس طرح اس کا ایک کامل نمونہ عملاً پیش کر دیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ کی حجّتِ بالغہ قائم ہو جائے اور محاسبۂ اخروی کے موقع پر انسان یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں اپنے اُلجھے ہوئے عمرانی عقدوں اور پیچ در پیچ سیاسی و معاشی مسائل کا کوئی متوازن اور معتدل حل دیا ہی نہیں گیا ــــ

یہ بات بادنیٰ تامّل سمجھ میں آسکتی ہے کہ اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ مبارکہ کے

مقدم الذکر پہلو کے اعتبار سے بھی حکمتِ تامّہ کی بھی ضرورت تھی اور بصیرتِ کاملہ کی بھی ، بالخصوص نفسیاتِ انسانی کا گہرا فہم تو اس کے ضمن میں لازمی و لابدی اہمیّت کا حامل ہے لیکن بعثت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا موخر الذکر پہلو تو ان سے بھی بڑھ کر اجتماعیاتِ انسانی کے ضمن میں گہری بصیرت اور اعلیٰ ترین انتظامی صلاحیتوں کا متقاضی تھا جن کے بغیر اس میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جاسکتا کجا یہ کہ کامیابی کے آخری مراحل سے ہم کنار ہُوا جاسکے! اور واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا یہ پہلو اس درجہ روشن و تابناک ہے کہ اغیار و اعداء کو بھی اپنی تمام تر کور چشمی اور بد باطنی کے باوصف پُوری آب و تاب کے ساتھ نظر آتا رہا ہے! چنانچہ ایچ جی ویلز ہو یا سر ولیم میور اور ٹائن بی ہو یا پروفیسر منٹگمری واٹ سب نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن تدبر و معاملہ فہمی دُور اندیشی و پیش بینی اور حُسنِ تدبیر و حُسن انتظام کو بھرپُور خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ اگرچہ یہ سعادت تو صرف دورِ حاضر کے ایک امریکی مصنف مسٹر ہارٹ کے حصّے میں آنے والی تھی کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے دونوں پہلوؤں کو مساوی طور پر خراجِ تحسین ادا کرتا۔ بایں طور کہ اس نے اپنی تصنیف "THE 100" یعنی "نسل انسانی کے سو عظیم ترین افراد" میں سرِفہرست رکھا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دلیل کے ساتھ کہ "HE WAS EQUALLY SUCCESSFUL IN BOTH THE RELIGIOUS AS WELL SECULAR FIELDS." - یعنی آپؐ دینی و روحانی اور دنیوی و سیاسی جملہ اعتبارات سے نسل انسانی کے کامیاب ترین فرد ہیں! واضح رہے کہ اِن آراء کا تذکرہ صرف اس عربی مقولے کے پیش نظر کیا جا رہا ہے کہ "الفضل ما شهدت به الاعداء" یعنی اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں، ورنہ نہ ان لوگوں کے یہ اقوال ہمارے لیے کسی بھی درجے میں سند ہیں نہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کسی درجے میں ان کی محتاج ہے۔ الغرض آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ کے موخر الذکر تکمیلی و اتمامی پہلو میں آپؐ کی تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور بتمام و کمال ہُوا۔

مثل مشہور ہے "ہونہار بِروا کے چکنے چکنے پات" چنانچہ نبی اکرمؐ کی سیرت و شخصیت میں بھی تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور شروع ہی سے ہو گیا تھا۔ تجارت اور کاروبار کے ضمن میں ان کا اظہار جس شان و شوکت سے ہُوا وہ تو اظہر من الشمس ہے ہی اس لیے کہ یہ اسی کی

بنا پر ہُوا کہ ایک جانب قوم نے آپؐ کو 'الصادق' اور 'الامین' کا خطاب دیا اور دوسری جانب آپؐ ہی کی طرح قوم سے 'الطاہرہ' کے خطاب کی صورت میں اپنی پاک دامنی اور حُسنِ اخلاق کا لوہا منوا لینے والی خاتون حضرتِ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پیغامِ نکاح موصول ہُوا۔ تجارت کے علاوہ دوسرے قومی معاملات میں بھی قبل از آغازِ وحی آپؐ کے حُسنِ تدبیر اور حُسنِ انتظام کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ظہور وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ مثلاً یہ کہ "حلف الفضول" کے ذریعے آپ نے قوم کے ایسے صالح نوجوانوں کو منظم کرنے کی سعی فرمائی جو ظالم کا ہاتھ روکنے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگانے کا حلف اُٹھائیں اور کعبے کی تعمیرِ نو کے دوران حجرِ اسود کو نصب کرنے کے موقع پر جس خون خرابے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ صرف آپؐ کے تدبّر و حُسنِ انتظام کی بدولت ٹل سکا۔

آغازِ وحی کے بعد سے ہجرت تک کے زمانے میں اگرچہ مجموعی طور پر آپؐ کی سیرتِ مطہرہ کے بعض دوسرے پہلو جو دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے زیادہ نمایاں رہے، تاہم اس دوران میں بھی ایک جانب تو حُسنِ انتظام کا ظہور دعوت و تبلیغ کے لیے اختیار کئے جانے والے طریقوں اور ذریعوں کے ضمن میں ہوتا رہا، جیسے "وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" یعنی "خبردار کیجئے اپنے قریبی عزیزوں کو" کے حکم ربانی پر عمل کے سلسلے میں دو بار دعوتِ طعام کا اہتمام اور "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" یعنی "اب ڈنکے کی چوٹ کہیے جس کا حکم آپ کو دیا گیا ہے!" کے حکم خداوندی کے ضمن میں قوم کو جمع کرنے کے لیے عمدہ ترین انتظامی تدبیر یعنی کوہ صفا پر چڑھ کر "واصباحاہ" کا نعرہ لگانا! وَقِسْ عَلیٰ ذالک ـــ اور دوسری طرف اسی دعوتی و تبلیغی سرگرمی کے بالکل متوازی اور پہلو بہ پہلو آپؐ کی تنظیمی استعداد بھی بھرپور طور پر مسلسل بروئے کار رہی جس کے نتیجے میں آپؐ نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے جو انسانی مواد یعنی "HUMAN MATERIAL" جمع کیا۔ اُس نے بدھ مت کے بھکشوؤں کے مانند فقیروں اور درویشوں کے ایک انبوہ کے بجائے "اعلاء کلمۃ اللہ" اور "اظہارِ دینِ حق" کے لیے جان لڑا دینے والوں کی ایک ایسی منظم جماعت کی صورت اختیار کی جس نے مدنی دور میں اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ، یعنی "اللہ تو محبت کرتا ہے ان سے جو اس کی راہ میں جنگ کریں ایسی صفیں باندھ کر گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہُوئی

دیوار ہوں !" کی عملی تفسیر بن کر دکھا دیا ۔ یہ تنظیم ظاہر ہے کہ کسی ایسے ناظم یا منتظم کے بغیر ممکن نہیں ہے جس میں تنظیمی و انتظامی صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہوں ۔ اور یہ ناظم اور منتظم ظاہر ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھے !

حیاتِ طیبہ کے مکی دَور کے وسط میں تعذیب و تشدد یعنی PERSECUTION کے شدت اختیار کرنے پر اہلِ ایمان کو ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت بھی آپ کے حسنِ انتظام کا شاہکار ہے ۔ اور پھر ہجرتِ مدینہ منورہ کے موقع پر بھی اس عظیم نقل مکانی کو اس طور سے منظم کرنا کہ جماعت المسلمین کے اکثر افراد کو اپنے سامنے مدینہ روانہ فرمانے کے بعد آپ نے آخر میں رختِ سفر باندھا جس کے نتیجے میں سفرِ ہجرت نے ایک منظم نقل و حرکت کی صورت اختیار کر لی نہ کسی بھگدڑ یا فرار کی ۔ یہ پوری صورتِ حال بھی بلاشبہ ایک عظیم تنظیمی و انتظامی استعداد کی مظہرِ اتم ہے !

رہا مدنی دَور تو اس کے بارے میں تو کچھ عرض کرنا بلاشبہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے اس لیے جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ ان دس سالوں کے دوران آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسنِ تدبر و معاملہ فہمی ، دُور اندیشی و پیش بینی ، ترتیب و تنظیم اور انتظام و انصرام کے ایک دو نہیں سینکڑوں اور ہزاروں مظاہر سامنے آتے ہیں جن پر مؤرخین اور محققین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں اور بڑے سے بڑے مدبّر و سیاستدان دنگ رہ جاتے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ناظم اور منتظم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ ایک فردِ واحد میں اور اتنے محاسن و کمالات کا اجتماع ، ہر جہت اور ہر پہلو سے حسنِ تدبیر و تدبّر اور حسنِ تنظیم و انتظام کا مظہرِ اتم ، پھر لطف یہ کہ حیاتِ انسانی کے کسی ایک ایسے گوشے کا تعین ممکن ہی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حُسنِ انتظام کا ظہور دوسرے گوشوں سے زیادہ ہوا ہے ۔ گویا بات صد فی صد وہی ہے کہ ؎

"ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست"

مسلمانوں کا جو اجتماعی نظام نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا ، اس میں نظم و تنظیم کو جو اہمیت آپ نے دی اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ آپ نے

عبادات کے نظام کو بھی ایک اجتماعی نظم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہاں تک کہ نماز کے بارے میں شدید تاکید فرما دی کہ اسے باجماعت ادا کیا جائے خواہ سفر ہو خواہ حضر اسے کسی صورت ترک نہ کیا جائے۔ چنانچہ امام ابو داؤدؒ نے ایک روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے یہ نقل فرمائی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اِذَا کَانَ ثَلٰثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ" یعنی جب سفر میں تین آدمی ہوں تو ان میں سے ایک کو لازماً امیر بنا لیا جائے اور دوسری روایت حضرت ابو الدرداءؓ سے نقل فرمائی کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَا مِنْ ثَلٰثَۃٍ فِیْ قَرْیَۃٍ اَوْ بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِیْھِمُ الصَّلٰوۃُ اِلَّا وَقَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَیْھِمُ الشَّیْطٰنُ فَعَلَیْکَ بِالْجَمَاعَۃِ فَاِنَّمَا یَاْکُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِیَۃَ " یعنی "اگر کسی بستی یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور پھر وہ نماز باجماعت کا نظام قائم نہ کریں تو ان پر شیطان لازماً مسلط ہو کر رہے گا۔ سنو! جماعت سے وابستہ رہو اس لیے کہ بھیڑیا ریوڑ سے علیحدہ رہنے والی بھیڑ کو ضرور ہڑپ کر جاتا ہے!" پھر اس نماز باجماعت میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذوقِ ترتیب و تنظیم اسے برداشت نہ کر سکتا تھا کہ صف ٹیڑھی ہو اس لیے کہ صفوں کی کجی بھی جذبِ اندرون کے فقدان کی غمازی کرتی ہے لہٰذا تکبیرِ تحریمہ سے قبل آپؐ کی نوائے شیریں بلاناغہ بلند ہوتی تھی کہ "سُدُّوا صفوفکم فان تسویۃ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَۃِ الصَّلٰوۃِ!" اپنی صفوں کو سیدھا کرو اس لیے کہ صفوں کو سیدھا کرنا بھی اقامتِ صلوٰۃ کے آداب میں سے ہے!! — مسلمانوں کی حیاتِ ملی کے اس اساسی اور بنیادی شعبے یعنی عبادت میں جس میں بالعموم اجتماعیت پر انفرادیت مقدم رہتی ہے — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نظم و تنظیم کو اس درجہ اہمیت دی ہے تو اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ حیاتِ اجتماعی کے دوسرے شعبوں میں انتظام و انصرام کا عالم کیا ہوگا —!

ع "قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا!"

مدینہ منورہ کی چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست کا چارج سنبھالنے کے فوراً بعد معاشرے کی تنظیمِ نو اور دفاعی انتظامات کا جو اہتمام آپ نے فرمایا وہ ملی و ملکی سطح حکومت و ریاست کے معاملات کے ضمن میں آپ کے حسنِ انتظام کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ چنانچہ ایک جانب آپؐ نے یہود سے معاہدے کر کے مدینے کے دفاع کا انتظام فرمایا

— اور دوسری جانب مہاجرین اور انصار میں مواخات یعنی بھائی چارے کے ذریعے معاشرے کی تنظیم نو کا اہتمام کیا اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان دونوں معاملات میں ادنیٰ سی چوک یا ذرا سی تاخیر بھی آئندہ حالات و واقعات کے رُخ کو بالکل بدل کر رکھ سکتی تھی ! اور کسی بھی مدبر یا منتظم کے وقت کے تقاضوں کو بروقت سمجھ کر ان کے لیے مناسب انتظام کر لینے ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے !

مدنی دَور کے ابتدائی آٹھ سالوں کے اکثر و بیشتر حصّے کے دوران مسلح تصادم کا سلسلہ جاری رہا ۔ اور اس کے ضمن میں بھی جہاں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کے شاہکار مسلسل سامنے آتے ہیں اور آپ کی حکمتِ حربی، مہارتِ جنگ اور سپہ سالارانہ صلاحیتوں کا اظہار ایسے پرشکوہ انداز میں ہوتا ہے کہ دوست دشمن سب مرحبا کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں وہاں فوجوں کی ترتیب و تنظیم ، رسد کا اہتمام و انصرام ، چھاپہ مار دستوں کی برموقع ترسیل اور دشمن کی ہر ممکن چال کو ناکام بنانے کے لیے پیش بندی کے ضمن میں آپؐ کی انتظامی صلاحیتوں کا ظہور بھی تمام و کمال ہوتا رہا ۔

تا آنکہ ۸ھ میں فتح مکّہ اور معرکۂ حنین کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو عرب پر فیصلہ کن غلبہ عطا فرما دیا اور اطراف و اکناف عرب سے تمام قبائل کے وفود نے مدینہ منوّرہ حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی گویا "وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا" کا سماں بندھ گیا تب آپؐ کی انتظامی صلاحیتیں پُورے طور پر بروئے کار آئیں اور پُورے جزیرہ نمائے عرب میں وہ نظام قائم ہوا جس کی داغ بیل تو آنحضورؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بنفسِ نفیس اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری دو سالوں کے دوران ڈال دی تھی لیکن جس پر نظامِ اسلامی کا قصرِ عظیم اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ دورانِ خلافتِ راشدہ تعمیر ہُوا ۔

اس انتظام و انصرام مملکتِ اسلامی کے ضمن میں ولاۃ و عمّال کا تقرر بھی شامل تھا، ائمہ و مؤذنین کی تقرری بھی شامل تھی ، محصّلینِ زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی بھی تھی ، جنگوں کا انسداد بھی تھا ، غیر قوموں سے گفت و شنید و صلح و مصالحت کے معاملات بھی تھے ، انسداد جرائم اور اقامتِ حدود و اجرائے تعزیرات کا نظام بھی تھا ۔ حکّام و عمّال اور محصّلین زکوٰۃ و فدیہ کی خبر گیری اور احتساب کا سلسلہ بھی تھا اور ان سب کے ساتھ

ساتھ تھا۔ قیامِ حکومتِ اسلامی کا اصل اور اوّلین مقصد یعنی تبلیغ و دعوتِ دین، تربیت و اصلاحِ عوام اور تعلیم و تلقین شریعت !! اور یہ سب کچھ تو تھا اندرونِ ملکِ عرب! اس پر مستزاد تھیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عمومی اِلَی کافّۃِ النَّاسِ بشیراً وَنذیراً" کی ذمہ داریوں کے ذیل میں آپؐ کی مصروفیات یعنی تحریر دعوت نامہ ہائے مبارک اور ترسیل وفود، اور چونکہ ان کے ضمن میں آغاز ہوگیا سلطنتِ روما کے ساتھ عسکری تصادم کا، لہٰذا ترتیب و تنظیم جیوش، جس کے ضمن میں اولاً واقع ہوئی ثانیاً پیش آیا غزوۂ موتہ، سفرِ تبوک اور ثالثاً تیار ہوا جیشِ اُسامہ، جو روانگی کے لیے تیار ہی تھا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور رفیقِ اعلیٰ کی جانب مراجعت اختیار فرمائی۔

فصلّی اللہ عَلَیہِ وَسَلَّمَ تسلیماً کثیراً کثیرا وفداہ آباؤنا و اُمّھاتنا!

عقلیں دنگ ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات دنیوی کے آخری دو سال کتنی متنوع اور گوناگوں مصروفیتوں میں بسر کیے ـــ اور پھر یہ کہ آج تک کوئی نہیں کہہ سکا کہ فلاں معاملے میں انتظامی اعتبار سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غلطی کا صدور ہوگیا تھا۔" فارجع البصرَ ھَل ترىٰ من فطورٍ ٥ ثُمَّ ارجع البصر کرَّتَینِ ینقلب الیك البصر خاسئًا وَّ ھُوَ حسیرٌ ٥" ذرا نظر دوڑاؤ تو ـــ کوئی خامی نظر آتی ہے؟ پھر بار بار اچھی طرح دیکھو، تمہاری نگاہ تھک ہار کر واپس آجائے گی اور کسی پہلو سے کسی غلطی کی نشاندہی تم نہ کرسکو گے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

دورانِ ماہ ربیع الاوّل ضرور مطالعہ فرمائیں

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت اور انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج

تالیف: ڈاکٹر اسرار احمد

صفحات: ۶۴ - سفید کاغذ - عمدہ طباعت - قیمت فی نسخہ: تین روپے

دعوتِ قرآنی کا لبِّ لباب

اور

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جانب خصوصی التفات

کے ضمن میں

داعیانِ حق کو جامع ہدایات

خواتیم سورۂ اعراف کی روشنی میں

یعنی سورۂ اعراف کی آخری گیارہ آیات کی تشریح پر مشتمل

ڈاکٹر اسرار احمد

کی چار تقاریر

جو ماہ جنوری ۷۹ء کے دوران ہر جمعہ کی صبح ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئیں

(۱)

سورۂ اعراف کی آیات ۱۹۶ تا ۱۹۸ حسبِ ذیل ہیں :

اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ۱۹۶ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ ۱۹۷ وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَسْمَعُوْا وَتَرٰىھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ۱۹۸ (ترجمہ) : "یقیناً میرا حامی کارساز اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل فرمائی ہے، اور وہ تمام نیکوکاروں کا کارساز و مددگار ہے۔ اور اُسے چھوڑ کر جنھیں تم پکارتے ہو، وہ نہ تمھاری ہی مدد کر سکتے ہیں نہ خود اپنی۔ اور اگر تم اُن کو رہنمائی کے لئے پکارو تو وہ تمھاری بات سُن بھی نہیں سکتے تمھاری رائے میں وہ تمھیں دیکھ رہے ہیں، حالانکہ وہ کچھ نہیں دیکھتے !"

سُورۂ انعام اور سورۂ اعراف دونوں کے مرکزی مضامین توحید و رسالت، اور بنی اسمٰعیل پر بالخصوص اور جمیع اہلِ عرب پر بالعموم اتمامِ حُجّت ہیں۔ اور سورۂ اعراف کے اس آخری حصّے میں ان تمام کا ایک مختصر مگر جامع خلاصہ بیان ہوا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ ترجمے سے واضح ہو گیا ہے، اِن آیات میں توحیدِ الٰہی کا لُبِّ لُباب بھی آ گیا ہے اور جُملہ انواع و اقسامِ شرک خصُوصاً اصنام پرستی کا ردّ بھی بڑی فصاحت و بلاغت کے ساتھ ہو گیا ہے۔

توحید یا ایمان باللہ کا لُبِّ لُباب اور اصل حاصل اللہ پر کامل توکّل اور اُس کی نُصرت و حمایت اور دستگیری و کارسازی پر مکمّل اعتماد ہے۔ جس کے نتیجے میں بندے اور ربّ کے مابین باہمی محبّت و دوستی کا وہ دوطرفہ تعلّق استوار ہوتا ہے، جسے اصطلاحِ دین میں 'ولایت' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس کا عظیم ثمرہ دُنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں خوف اور حُزن سے کامل رُستگاری ہے۔

اِس عالَمِ اسباب میں زندگی بسر کرتے ہوئے انسان اپنے آپ کو تأثّر و انفعال کے ایک ناپیدا کنار سمندر میں غوطے لگاتے پاتا ہے اور ہر جہار طرف سے خطرات و خدشات اور مصائب و مشکلات میں گھرا ہوا محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ یہ کبھی آفاتِ سماویہ کی زد میں ہوتا ہے تو کبھی مصائبِ ارضی اُسے گھیر لیتے ہیں، کبھی اغیار و اعداء کے ہاتھوں صدمے سہتا ہے تو کبھی خود اپنوں کے ہاتھوں دکھ اٹھاتا ہے۔ کبھی ظاہری اور جسمانی تکلیفیں اُسے پریشان

کرتی ہیں، تو کبھی ذہنی کوفت، قلبی اذیّت اور نفسیاتی کرب اُس کا نصیب بنتے ہیں۔ الغرض اِس دُکھ بھری دُنیا میں جہاں قدم قدم پر خدشوں اور اندیشوں کا سامنا رہتا ہے۔ انسان کو ایسے مخلص ہمدم و رفیق، قوی حامی و مددگار اور قابلِ اعتماد دستگیر اور کارساز کی ضرورت کا شدّت سے احساس ہوتا ہے، جس کی نصرت و حمایت پر وہ پورا بھروسہ کر سکے! انسان کی یہ فطری ضرورت اللہ تعالیٰ پر ایمان و یقین کے ذریعے بتمام و کمال پوری ہوجاتی ہے۔ اِس لئے کہ بندۂ مومن یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ اُس کا حامی و ناصر ہے۔ اور ایک طرف تو قوی و عزیز اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیرٌ ہے لہٰذا زمین و آسمان کی کوئی چیز اُس کی مرضی کے علی الرّغم نہ کوئی گزند پہنچا سکتی ہے نہ نقصان، بقولِ شاعر ع: "دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر است!" دوسری طرف وہ سمیع و بصیر، اور بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیمٌ ہے اور ظاہر و باطن اور حاضر و غائب سب کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا ہمارے نفع و نقصان کو ہم سے بڑھ کر جاننے والا اور ہماری مصلحتوں سے ہم سے بڑھ کر واقف ہے۔ پھر وہ ہر آن اور ہر جگہ موجود بھی ہے۔ گویا کہ اُس کے ماننے اور چاہنے والوں اور اُس کی پناہ میں آجانے والوں کو اُس کی دائمی معیّت حاصل ہوجاتی ہے بمصداق الفاظِ قرآنی: "وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ" (اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے!) —— یہ ہے فی الجملہ "ولایتِ الٰہی" کی کیفیت جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ وہی ہے جو اس مشہور آیت میں بیان ہوا کہ: "أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝" (آگاہ ہوجاؤ کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی انہیں حُزن سے سابقہ پیش آتا ہے!) ۔ گویا ایمان باللہ یا توحیدِ کامل کے ذریعے انسان کی وہ فطری ضرورت جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے باحسن وجوہ پوری ہوجاتی ہے اور بتمام و کمال بھی! ——

اب جن لوگوں کی رسائی معرفتِ الٰہی تک نہیں ہو پاتی وہ بھی اپنی اِس فطری ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی نہ کسی کو جھوٹ موٹ کا حامی و مددگار بنا کر کسی درجے میں ذہنی سہارا بنا لیتے ہیں، اور اُن سے مدد کی درخواست کر کے تسکین حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر کبھی دیویوں اور دیوتاؤں اور GODS اور GODESSES کے لشکر اختراع کر لئے گئے جیسے ہندوستان اور یونان میں ہوا۔ کبھی گذرے ہوئے بزرگوں اور اللہ کے نیک بندوں کے خیالی مجسّمے تراش لئے گئے اور اُن سے حاجت روائی اور مشکل کشائی کی درخواستیں کی

جانے لگیں جیسے قومِ نوح نے کیا، کبھی شمس و قمر اور ثوابت و سیاروں کے نام پہ ہیکل تعمیر کر لئے گئے اور اُن کے لئے مراسمِ عبودیت بجائے جانے لگے۔ جیسے قومِ ابراہیم نے کیا۔ اور کبھی شجر و حجر حتیٰ کہ حشرات الارض تک کو مقدس مان کر اُن کی پُوجا پاٹ شروع کر دی گئی۔ لیکن وائے ناکامی کہ شرفِ انسانیت سے اِس طرح خود اپنے ہاتھوں محروم ہو جانے کے باوجود انسان کے ہاتھ کچھ بھی نہ آیا اور اُس کی حالت اُس مسافر کی سی ہو گئی کہ : ع
"غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا!"۔

ایمان باللہ کے مضبوط سہارے اور توحیدِ الٰہی کے عُروۃ وُثقیٰ سے محروم انسان کا نقشہ سُورۂ حج کی آیات ۱۵، ۳۱ میں نہایت خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے۔ چنانچہ آیت نمبر ۱۵ میں ارشاد ہوتا ہے : "جو شخص دُنیا اور آخرت میں اللہ کی نصرت و حمایت کی اُمید کا رشتہ توڑ بیٹھا ہو وہ ذرا آسمان کی طرف رسّی تانے اور پھر اُسے کاٹ دے اور دیکھے کہ کیا اُس سے اُس کی تشویش میں کوئی کمی آئی!"۔ اور آیت نمبر ۳۱ میں ارشاد ہوتا ہے : "اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے، وہ ایسے ہے جیسے آسمان سے گر پڑا ہو اور اب خواہ اُسے پرندے اُچک لے جائیں، خواہ ہوا اُسے کسی دُور دراز مقام پر لے جا کر پٹخ دے!" گویا اللہ پہ یقین اور اس پہ توکّل و اعتماد کا تعلّق جو توحید کا اصل ثمرہ ہے اُس رسّی کے مانند ہے جس سے کوئی انسان کسی مقامِ بلند سے لٹکا ہوا ہو۔ اور جسے مضبوطی سے تھامے رکھنے ہی میں خیریت اور عافیت کی واحد صورت مضمر ہو، بفحوائے الفاظِ قرآنی : "وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا!" اور شرک کی مثال ایسے ہے کہ کسی اور خیالی اور موہوم سہارے کے دھوکے میں انسان اُس رسّی کو چھوڑ بیٹھے اور فضا میں ہچکنیاں کھانے لگے۔ نتیجۃً اس واحدِ حقیقی و واقعی سہارے سے محرومی کے بعد اب وہ کُلّیۃً شکاری پرندوں کے رحم و کرم پر ہو کہ جیسے چاہیں تِکّا بوٹی کر دیں یا ہواؤں کے رحم و کرم پر کہ جہاں چاہیں لے جا گرائیں ؂

آیاتِ زیرِ درس میں بھی اسی فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کہلوایا گیا ہے کہ :— لوگو! میرا حامی و ناصر اور مددگار و کارساز تو اللہ ہے جو سب نیکوکاروں کی حمایت و مدد کرتا ہے۔ البتّہ جنھیں تم پُکارتے ہو اُن کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں، وہ تمھاری مدد تو کیا کریں گے، خود اپنی مدد سے بھی قاصرِ محض ہیں!

حیاتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصّلوٰۃ والسّلام کے دوران ہُوبہُو یہی نقشہ دامنِ اُحد میں کھینچ گیا تھا، جب حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور لشکرِ کفّار و مشرکین کے سپہ سالار تھے، نعرہ لگایا: "اُعْلُ هُبَل!" ـــــ تو آنحضورؐ نے جواب دلوایا کہ: "اَللّٰهُ اَعْلٰی وَ اَجَلّ!" اور پھر جب اُدھر سے نعرہ لگا: "لَنَا عُزّٰی وَلَا عُزّٰی لَکُمْ!" ـــــ تو اِدھر سے جواب دیا گیا کہ: "اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰی لَکُمْ" ـــــ ہمارا مولا و مددگار اور حامی و ناصر تو اللہ عزّ و جلّ ہے۔ جب کہ اے مشرکو، اور کافرو! تمھارا کوئی حامی و ناصر ہے، نہ کارساز و دستگیر!!!

اِنسان کو جہاں دوسری بہت سی احتیاجات لاحق ہیں، چنانچہ بطن و فرج کے تقاضے بھی ہیں اور کام و دہن کے بھی اور تن ڈھانپنے کی ضرورت بھی ہے اور سر چھپانے کی بھی، وہاں بحیثیتِ حیوانِ عاقل و اشرف المخلوقات اِس کی سب سے بڑی ضرورت عقلی و ذہنی رہنمائی اور فکری و نظری ہدایت ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اجرائے وحی، اور انزالِ کُتُب کا سلسلہ جاری فرمایا۔ اور نبیوں اور رسولوں کو مبعوث کیا۔ چنانچہ آخری اور مکمّل کتاب اور کامل و ابدی رہنمائی ہے قرآن مجید اور آخری نبی اور کامل رسول ہیں رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم۔ یہی وجہ ہے کہ اِس سلسلۂ کلام میں بھی اللہ تے اسی انعامِ عظیم اور نعمتِ کُبریٰ کا حوالہ دیا کہ: اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ! (میرا حامی و کارساز تو وہ اللہ ہے جس نے تنزیلِ کتاب کا اہتمام فرمایا!) اور قرآنِ مجید کی صورت میں اپنا ازلی و ابدی کلام مجھ پر نازل فرمایا، جو گویا: ع "از کجامی آید ایں آوازِ دوست!" کے مصداق اپنے ماننے اور چاہنے والوں کے لئے شہنشاہِ ارض و سما کے عظیم ترین ہدیہ و انعام اور اُس کی "رحمانیّت" کا سب سے بڑا مظہر ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی: اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۝ ـــــ آیاتِ زیرِ درس میں اس اعتبار سے بھی مشرکین کی محرومی کا بڑا حسرتناک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جہاں تمھارے لئے حامی و ناصر کوئی نہیں، وہاں ہادی و رہنما بھی کوئی نہیں! اور اگر تم اپنے مزعومہ خداؤں، اور موہومہ معبودوں سے ہدایت چاہو گے اور رہنمائی کے طالب ہو گے تو اس معاملے میں بھی سوائے حرمان و یاس کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اِس لئے کہ وہ تو بیچارے سُن بھی نہیں سکتے، کجا یہ کہ تمھیں راستہ دکھائیں اور تمھاری رہنمائی کریں۔ اِس ضمن میں خاص طور پر

اصنام پرستوں کی خوش عقیدگی کا پردہ چاک کر دیا گیا کہ بظاہر تو تم یہ ضرور محسوس کرتے ہو گے کہ تمہارے یہ بُت تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ لیکن عقل کے اندھو ذرا سوچو کہ ان پتھریلی آنکھوں میں بصارت کہاں! ـــــ کاش کہ تمہیں ہی بصیرت کی کوئی رمق نصیب ہو جائے۔

اِن تین آیات میں جو مضامین بیان ہوئے ہیں وہ اِس سے قبل اسی سورت کی آیات ۱۹۱ تا ۱۹۳ میں بھی آ چکے ہیں۔ چنانچہ وہاں فرمایا گیا تھا: "کیا یہ لوگ شریک ٹھہراتے ہیں نہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتے بلکہ خود مخلوق ہیں؟ اور نہ اُن کی مدد کر سکتے ہیں نہ اپنی۔ اور اگر تم ان سے طالب ہو ہدایت کے تو پلٹ کر جواب تک نہیں دے سکتے۔ تمہارے حق میں بالکل برابر ہے، خواہ اُنہیں پکارو یا خاموش رہو!"

اللہ ہمیں شرک کی ہر صورت سے بچائے اور اپنی ذاتِ تبارک و تعالیٰ پہ کامل یقین و ایمان اور توکّل و اعتماد پورے خلوص اور اخلاص کے ساتھ عطا فرمائے۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

(۲)

سورۂ اعراف کی آیات ۱۹۹ تا ۲۰۲ حسبِ ذیل ہیں:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۝۱۹۹ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۰۰ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝۲۰۱ وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۝۲۰۲

(ترجمہ): "(اے نبی!) عفو و درگزر کی روش اختیار کرو، نیکی اور بھلائی کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں کے مُنہ نہ لگو! اور اگر کبھی شیطان کے وسوسے اور اُکساہٹ سے سابقہ پیش آ ہی جائے تو اللہ کی پناہ چاہو۔ یقیناً وہ سب کچھ سُننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ بے شک اللہ کے نیک بندوں کو جب کوئی شیطانی چھُوت لاحق ہونے لگتی ہے تو وہ خدا کا دھیان کرتے ہیں۔ اور فوراً ہی اُنہیں سُوجھ حاصل ہو جاتی ہے۔ رہے اُن (شیطانوں) کے بھائی تو اُنہیں تو وہ گمراہی و کج رَوی میں بڑھاتے ہی رہتے ہیں اور (اُن کی تباہی و بربادی میں) کوئی کسر نہیں چھوڑتے!"

یہ سورۂ اعراف کے آخری حصّے کی آیات ہیں اور اِس کے بعد صرف چار آیات اور ہیں،

اور مکّی سورتوں کے عام اُسلوب کے مطابق اُن میں بھی نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جانب خصوصی التفات ہے۔ اور ان حالات کے مطابق کہ جن سے آپؐ اُس وقت دوچار تھے جب یہ سورت نازل ہوئی آپؐ کو چار واضح ہدایات دی گئی ہیں، جن میں ہر اس شخص کے لئے ابدی رہنمائی ہے جو آپؐ کے اتّباع میں دعوتِ اِلیٰ اللہ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کیلئے اپنی صلاحیتیں اور توانائیاں صرف کرے!

پہلی ہدایت ہے: "عفو و درگذر کی رَوِش اختیار کرو!" یہ دعوتِ حق کی راہ کا پہلا سُنہری اُصُول ہے۔ اِس لئے کہ ظاہر ہے کہ دعوتِ خیر کی ضرورت وہیں پیش آتی ہے، جہاں شرّ کا غلبہ ہو اور اللہ کی طرف بُلانے کی سعی میں ان ہی لوگوں سے خطاب ہوتا ہے جو خدا سے غافل ہوکر جذبات اور خواہشات و شہوات کی پیروی میں مگن ہوں۔ ایسے لوگ لہو و لعب اور عیّاشی و لذّت کوشی کے اِس درجہ رسیا ہو چکے ہوتے ہیں کہ انہیں چھوڑنا تو در کنار ان کے خلاف کچھ سُننا تک اُنہیں گوارا نہیں ہوتا بلکہ وہ: بَلْ يُرِيدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ط کے مصداق چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے حال میں ہی مست رہنے دیا جائے لہٰذا آغاز میں حق و صداقت اور خیر و صلاح کی دعوت پر اُن کا ردِّ عمل بہت شدید ہوتا ہے اور وہ داعیانِ خیر کے درپئے آزار ہو جاتے ہیں۔ اِس مرحلے پر داعئ حق کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ صبر کرے اور نہ تو لعن طعن کی رَوِش اختیار کرے، نہ دل برداشتہ ہوکر دعوت ہی سے کنارہ کش ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوتِ نبویؐ کے آغاز میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو صبر کی پیہم اور مسلسل اور بار بار پے بہ پے تلقین کی گئی۔ جیسے سورۂ مزّمّل میں فرمایا: فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ: "اے نبی! صبر کرو اُس پر جو یہ کہہ رہے ہیں!" سُورۂ مُدّثّر میں فرمایا: "وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ": "اور اپنے ربّ کیلئے صبر کرو!" — اور سورۂ نون میں ارشاد ہوا: "وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ": "اور اپنے ربّ کے حکم کے انتظار میں صبر کیجئے!" کہیں فرمایا: فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ: "صبر کیجئے جیسے ہمارے دوسرے اولوا العزم رسولوں نے صبر کیا!" — وَقِس علیٰ هٰذا

سورۂ اعراف کے اس مقام پر اس سے بھی آگے کی تلقین کی جا رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ لوگوں کی مخالفتوں اور ایذا رسانیوں پر صبر کیا جائے۔ بلکہ اُن کو باقاعدہ معاف کیا جاتا رہے اور دل میں بھی اُن کی جانب سے کسی کدورت کو راہ نہ دی جائے۔ یہاں تک

کہ اللہ سے بھی اُن کے لئے استغفار کیا جاتا رہے اور اُن کی ہدایت کے لئے دعا کی جاتی ہے۔
چنانچہ اسی شان کا تمام و کمال ظہور ہوا فتح مکّہ کے دن کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے
جان کے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کے لئے عام معافی کا اعلان فرما دیا کہ: "لَا تَثْرِيبَ
عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهبوا فانتم الطلقاء": "تم پہ آج کوئی ملامت بھی نہیں،
جاؤ تم سب آزاد ہو!" اور اسی کا ظہور ہوتا تھا مکّی دور میں بار بار جب لوگ آپ کو ستاتے
تھے اور ہر ممکن طریق پہ تکلیف پہنچاتے تھے اور آپ اللہ سے دعا فرمایا کرتے تھے: "اللّٰھم
اھدِ قومِي انھم لا یعلمون!": "اے اللہ میری قوم کو ہدایت فرما، یہ جانتے نہیں"
دوسری ہدایت اُس مقصد کو واضح کر رہی ہے جس کے لئے یہ صبر و ثبات اور عفو و
درگذر مطلوب ہے۔ یعنی: "نیکی اور بھلائی کی تلقین کئے جاؤ!" اور اُن کے رویّہ سے
دل برداشتہ ہو کر اپنے فرضِ منصبی سے دستکش نہ ہو جاؤ۔ اِس ضمن میں لفظِ "عُرف"
بہت قابلِ توجّہ ہے۔ حکمتِ قرآنی کی رُو سے انسان کو جہاں ظاہری بصارت سے نوازا
گیا ہے وہاں ایک باطنی بصیرت بھی عطا کی گئی ہے جس کی بنا پہ وہ نیکی اور بھلائی کو بھی
خوب پہچانتا ہے اور بدی اور برائی کو بھی جانتا ہے۔ بلکہ اس کی اصل فطرت نیکی کی طرف
رغبت اور میلان رکھتی ہے اور بدی سے اِبا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نیکی اور
خیر کو 'معروف' سے تعبیر کرتا ہے اور بدی اور شر کو 'منکر' سے! ۔ بُرائی میں مُلوّث لوگوں
کا مخالفانہ ردِّ عمل بھی اس بنا پہ نہیں ہوتا کہ وہ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کرتے بلکہ
صرف اِس لئے ہوتا ہے کہ بُرے ماحول کے اثرات اور ایک طویل عرصہ تک برائی میں ملوّث
رہنے کے باعث اُس کے اس درجہ خوگر ہو چکے ہوتے ہیں کہ اسے فوراً چھوڑنے پر آمادہ
نہیں ہوتے۔ لیکن اگر داعیانِ خیر، صبر و استقلال کے ساتھ دعوت دیتے چلے جائیں تو رفتہ
رفتہ آنکھوں کے پردے بھی ہٹتے چلے جاتے ہیں اور دلوں کا زنگ بھی اُترتا چلا جاتا ہے۔
یہاں تک کہ کل کے دشمن اور خون کے پیاسے آج کے ہمدم و رفیق بلکہ جاں نثار بن جاتے
ہیں، بفحوائے الفاظِ قرآنی: فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ
: "تو جس کے اور تمہارے مابین عداوت ہے وہ ایسے ہو جائے گا جیسے انتہائی گرم جوش
ساتھی اور مددگار ہو!"
تیسری ہدایت بھی نہایت اہم ہے، یعنی: "جاہلوں سے اعراض کرو!" یعنی نہ اُن

کے مُنہ لگو نہ اُن سے اُلجھو! واضح رہے کہ یہاں جاہل سے مراد ان پڑھ نہیں ہے بلکہ 'اَن گھڑ' ہے یعنی کندہ ناتراش یا وہ اکھڑ اور مشتعل مزاج انسان جسے عقل اور سوجھ سے کوئی واسطہ نہ ہو، بلکہ اس کی لگام صرف جذبات و شہوات کے ہاتھ میں ہو ــــ داعیانِ حق کے لئے لازم ہے کہ ایسے لوگوں سے الجھنے سے بچیں اس لئے کہ اُن سے بحث و نزاع میں الجھنے سے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ بلکہ اُلٹا وقت بھی ضائع ہوگا اور منزل بھی کھوٹی ہوگی۔ ایسے لوگوں سے اعراض ہی صحیح طرزِ عمل ہے، اور یہ اعراض بھی قرآنِ حکیم کے دوسرے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ اور حد درجہ حکیمانہ طرز پر ہونا چاہئے جس سے نہ تو فوری طور پر کوئی بدمزگی پیدا ہو نہ آئندہ بات کرنے کے مواقع ختم ہوں جیسے کہ سُورۂ مُزّمّل میں فرمایا: "وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ط": "اُن سے علیحدگی اختیار کرو، لیکن یہ علیحدگی بھی خوبصورت ہو!" اور سورۃ الفرقان میں عباد الرحمٰن کے اوصاف میں نہایت نمایاں طور پر بیان فرمایا: "وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا!": "اور جب نادان لوگ اُن سے اُلجھتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام!"

چوتھی ہدایت اس اعتبار سے اہم ترین ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو شاید ہی کبھی ایسا موقع پیش آیا ہو۔ لیکن دوسرے داعیانِ حق کے لئے اس کا ہر وقت امکان موجود ہے کہ شیطان کی اکساہٹ سے اُنہیں بھی غصّہ آجائے اور وہ بھی جاہلوں کے جواب میں کسی وقت مقامِ دعوت سے اُتر کر برابر کی سطح پر آجائیں اور اسی انداز میں جوابی حملہ شروع کردیں۔ فرمایا کہ اگر ایسا کبھی ہو بھی جائے تو فوراً اللہ کی پناہ طلب کرو اور شیاطینِ لعین کے حملے سے اللہ کی حفاظت کے مضبوط قلعے میں پناہ لے لو! ــــ اور یقین رکھو وہ سب کچھ سُننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس لئے کہ اسی یقین میں داعیٔ حق کی تسلّی اور دلدہی مضمر ہے کہ اللہ جانتا ہے کہ مجھ سے یہ غلطی کن حالات میں سرزد ہوئی: "وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ": "اور میں ہرگز اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا۔ نفس کا تو کام ہی یہ ہے کہ بُرائی کا حکم دے!" اس ضمن میں یہ قاعدہ کلیّہ بھی ارشاد فرمادیا گیا کہ خدا ترس اور نیکوکار لوگوں کا تو طریقہ ہی یہ ہے کہ جب بہ بنائے طبعِ بشری انہیں شیطان کی کوئی چھوت لاحق ہونے لگتی ہے اور شیطان کے وسوسے اور اشتعال انگیزی سے طبیعت میں غصّے کی آگ سلگنے لگتی ہے تو وہ فوراً مُتنبّہ ہوجاتے ہیں اور انہیں اس کی

ہوجاتا ہے کہ شیطانِ لعین اُن پر حملہ آور ہو رہا ہے، پس وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کے نتیجے میں نفس کی وہ طمانیت کا فور ہوجاتی ہے اور انہیں دوبارہ مکمل سوجھ حاصل ہوجاتی ہے ـــــ اور اُن کا دل نورِ یقین سے از سرِ نو روشن ہوجاتا ہے!

اِس کے برعکس معاملہ ہے اُن کا جو خود ہی شیطان کی پیروی اختیار کرکے اُس کے بھائی بندوں میں شامل ہوجائیں۔ یہ لوگ شیطان کے لئے نہایت عمدہ تختۂ مشق بن جاتے ہیں۔ وہ انہیں ورغلاتا رہتا ہے اور بدی کے راستے پر آگے بڑھاتا چلا جاتا ہے اور اُن کی تباہی و بربادی میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دیتا! شیطانوں کے بھائی کی اصطلاح قرآن حکیم میں سورۂ بنی اسرائیل میں بھی وارد ہوئی ہے یعنی: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ: "صرف نام و نمود کے لئے اللّوں تللّوں میں دولت لٹانے والے لوگ شیطانوں کے بھائی ہیں!" اور یہ بات بھی قرآن مجید میں متعدد مقامات پر واضح کردی گئی ہے کہ شیطانِ لعین کو کسی بھی انسان پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ ہاں جو لوگ خود ہی اُس کی پیروی اختیار کرلیں وہ کُلیتہً اُس کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور گویا اُس کے حوالے کردیئے جاتے ہیں کہ حسبِ ہلاکت کے گڑھے میں چاہے جا گرائے۔ چنانچہ سورہ حجر میں ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الْغٰوِیْنَ: "تجھے میرے بندوں پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہوگا۔ سوائے اُن بہکے ہوئے لوگوں کے جو خود ہی تیری پیروی اختیار کرلیں!" ـــــ فنعوذ باللّٰہِ العلیِّ العظیم مِنَ الشیطٰنِ الرّجیم اللعین

وَ اٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۳)

سورۂ اعراف کی آیات ۲۰۳ تا ۲۰۴ حسبِ ذیل ہیں:

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰیَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَیْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ مِنْ رَّبِّیْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّکُمْ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

(ترجمہ): اور (اے نبی!) جب تم اُن کے سامنے کوئی نشانی پیش نہیں کرتے تو یہ کہتے ہیں کہ اسے بھی کیوں نہ چھانٹ لائے؟ کہہ دو کہ میں تو بس اِسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو

میرا ربّ مجھ پر نازل فرماتا ہے۔ یہ تمھارے ربّ کی جانب سے آنکھیں کھول دینے والی آیات اور رہنمائی اور رحمت ہیں، اُن کے لئے جو ایمان لائیں۔ اور (دیکھو!) جب قرآن پڑھا جائے تو اُسے دھیان سے سُنو اور خاموش رہو تاکہ تم بھی رحمتِ خداوندی سے حصّہ پا سکو۔"

قرآنِ حکیم میں اکثر و بیشتر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ بعض مقامات پر یہ نسبت و تعلّق بہت نمایاں ہے جیسے آخری دو سورتوں یعنی مُعَوِّذَتَین میں اور پہلی دو مدنی سورتوں یعنی البقرہ اور آلِ عمران میں جنھیں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے "الزّہراوین" یعنی دو انتہائی تابناک سورتیں قرار دیا ہے۔ اور بعض مقامات پر یہ نسبت ذرا خفی ہے۔ سورۂ انعام اور سورۂ اعراف بھی طویل ترین مکّی سورتوں کے ایک نہایت حسین و جمیل جوڑے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ان کے مضامین میں بڑی گہری مناسبت موجود ہے۔ چنانچہ سورۂ انعام کے آغاز میں ایک مضمون نہایت شرح و بسط سے بیان ہوا ہے، جس کا ایک نہایت مختصر لیکن حد درجہ جامع ملخّص سورۂ اعراف کے آخر کی ان دو آیات میں بیان کر دیا گیا ہے۔

وہ مضمون ہے کفّارِ مکّہ اور سردارانِ قریش کا نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنی نبوّت و رسالت کے ثبوت میں کوئی واضح معجزہ یعنی کُھلی ہوئی حسّی نشانی دکھائیں جسے وہ بچشمِ سر دیکھ سکیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ جواب کہ تمھارا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا جائے گا۔ ہدایت بندوں کی ضرورت ہے نہ کہ خدا کی۔ اور ہدایت کے قدر دانوں اور طالبین کے لئے قرآنِ حکیم پوری طرح کفایت کرتا ہے، بحیثیت منبعِ ہدایت اور سرچشمۂ رہنمائی بھی، اور بحیثیّت نشانی اور معجزہ بھی!

کفّارِ قریش نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے جس نوعیّت کی نشانی کے طلبگار تھے اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیات ۹۰ تا ۹۳ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

"وہ کہتے ہیں ہم ہرگز آپ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ آپ زمین کو پھاڑ کر ہمارے لئے ایک چشمہ فی الفور جاری نہ فرما دیں، یا دفعتہً آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ پیدا ہو جائے اور آپ اس میں جا بجا نہریں رواں کر دیں، یا آپ آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہمارے اوپر گرا دیں جیسا کہ آپ کا خیال ہے (کہ قیامت میں ہوگا!) یا آپ اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آئیں، یا آپ کے لئے فوراً سونے کا ایک محل بن جائے، یا آپ

آسمان پر چڑھ کر دکھائیں۔ اور آپ کے چڑھنے کو بھی ہم نہ مانیں گے جب تک آپ ہم پر ایسی کتاب نہ اُتار لائیں، جسے ہم خود پڑھ سکیں — (اے نبی!) ان سے کہیئے پاک ہے میرا پروردگار، لیکن میرا دعویٰ اس کے سوا تو اور کچھ نہیں کہ میں ایک انسان ہوں جسے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے!!"

اِس ضمن میں سردارانِ قریش نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جس درجہ زچ کر دیا تھا اور آپؐ جس پیچیدہ صورتِ حال سے دوچار ہو گئے تھے۔ اس کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ بظاہر ان کا یہ مطالبہ درست اور معقول تھا کہ اگر آپؐ ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آپؐ کی نبوّت و رسالت پر ایمان لائیں تو آپؐ پر لازم ہے کہ آپ ہمیں کوئی واضح نشانی ایسی دکھائیں جیسی کہ انبیائے سابقین دکھاتے رہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا معجزۂ عصا و یدِ بیضا اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معجزات کہ مادر زاد اندھوں کو بینائی عطا فرما دیتے تھے اور مردوں کو زندہ کر دیتے تھے اور مٹی کے پرندے بنا کر پھونک مارتے تھے تو اُن میں جان پڑ جاتی تھی اور وہ اُڑنے لگتے تھے —— اب ظاہر ہے کہ ایسا کوئی معجزہ دکھانا کسی نبی یا رسول کی اپنی طاقت میں نہیں ہوتا بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ آلِ عمران میں جہاں جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے معجزات کا ذکر ہے وہاں وہاں بار بار "بِاِذْنِیْ" کے الفاظ کی تکرار ہوئی ہے اور نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بارے میں حکمتِ خداوندی میں یہ طے پا چکا تھا کہ آپؐ کو معنوی معجزہ تو وہ عطا کیا گیا جو کسی کو بھی نہیں دیا گیا یعنی قرآنِ حکیم، جس سے بڑا کوئی معجزہ ممکن ہی نہیں ہے اور جو ہمیشہ ہمیش قائم و دائم رہنے والا ہے —— لیکن آپؐ کی قوم کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا جائے گا کہ انہیں کوئی حسّی معجزہ اور وہ بھی اُن کے حسبِ منشاء دکھایا جائے۔ اِس کا مثبت سبب تو یہ ہے کہ اب نوعِ انسانی عہدِ طفولیّت سے نکل کر عقلی و شعوری بلوغ کے دَور میں داخل ہو چکی ہے لہٰذا اب اسے حسّی معجزات کے بجائے معنوی معجزے کے ذریعے حق کو پہچاننا چاہیئے۔ اور منفی سبب یہ کہ جو لوگ تکبّر یا حسد یا فسق و فجور کے عادی و خوگر ہونے کے باعث حق کو قبول نہیں کرنا چاہتے ان کے لئے ایسے معجزے بھی بے سود رہتے ہیں اور ماضی میں بھی کفّار و منکرین کے لئے اِس قسم کے معجزے بجائے سود مند ہونے کے اُلٹے مضر ثابت ہوئے اس لئے کہ اللہ کا اٹل قانون یہ ہے کہ ایسے معجزات دیکھ لینے کے بعد بھی جو قوم ایمان

نہیں لاتی وہ عذابِ خداوندی میں گرفتار ہو کر رہتی ہے! — الغرض یہ تھی وہ پیچیدگی یا DILEMMA جس سے آنحضورؐ دوچار تھے۔ کہ ایک طرف سردارانِ قریش اپنے مطالبے کی ظاہری معقولیت سے عوام کو ورغلانے میں کامیاب ہو رہے تھے اور دوسری طرف اللہ کا اٹل فیصلہ تھا کہ جو ہدایت کا طلبگار ہے وہ اسی قرآن سے ہدایت حاصل کرے کوئی خرقِ عادت معجزہ نہیں دکھایا جائے گا۔ اس صورتِ حال میں عین ممکن ہے کہ بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا ہو، اور کیا عجب کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں بھی کبھی یہ خواہش پیدا ہوئی ہو کہ کیوں نہ انہیں ایسا کوئی معجزہ دکھا ہی دیا جائے، تاکہ اس کے بعد خواہ سردارانِ قریش ایمان نہ لائیں، بہرحال ان کی زبان تو بند ہو جائے گی۔ اور عوام الناس پر جو اثر انہوں نے پیدا کر لیا ہے وہ تو ختم ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ پس منظر جس میں سورۂ انعام کی آیات ۳۳ تا ۳۷ میں ارشاد ہوا:

"(اے نبی!) ہم خوب جانتے ہیں کہ جو کچھ یہ لوگ کہتے ہیں آپ کو اس سے دکھ پہنچتا ہے۔ لیکن (آپ غور کریں کہ) یہ لوگ آپ کو تو جھوٹا نہیں کہہ رہے، بلکہ یہ ظالم تو اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہیں۔ اور (آپ کو معلوم ہی ہے کہ) آپ سے پہلے رسولوں کو بھی جھٹلایا گیا تھا تو انہوں نے اس تکذیب و ایذا پر صبر کیا۔ اللہ کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا، اور گذشتہ پیغمبروں کے حالات آپ کو معلوم ہی ہو چکے ہیں۔ اور اگر ان کا اعراض آپ پر گراں گذر رہا ہے تو اگر آپ کے لئے ممکن ہے تو آپ زمین میں کوئی سُرنگ کھود کر یا آسمان پر سیڑھی لگا کر اُن کے لئے کوئی نشانی لے آئیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ تو آپ جذبات سے مغلوب ہونے والوں میں سے نہ بنیں، ایمان تو صرف وہی لائیں گے جو (فی الواقع) سنتے ہیں۔ رہے مردے تو اللہ ہی انہیں اُٹھائے گا، اور پھر یہ اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے! یہ کہتے ہیں اُن پر ان کے ربّ کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اُتاری گئی! ان سے کہہ دیجئے اللہ اس پر قادر ہے کہ نشانی اُتار دے لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں!"

— اور یہی مضمون ہے جس پر سورۂ اعراف کے خاتمے پر پھر توجّہ دلادی گئی کہ:

"جب آپ ان کے پاس کوئی نشانی نہیں لاتے تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کوئی

نشانی کیوں نہیں چھانٹ ہی لاتے ؟"۔ اس جملے میں اعتراض اور الزام کے ساتھ ساتھ تمسخر و استہزاء بھی چھپا ہوا ہے۔ اس لئے کہ قرآن مجید کے بارے میں سردارانِ قریش نے اپنے عوام کو اس پروپیگنڈے کے فریب میں مبتلا کر دیا تھا کہ یہ اِدھر اُدھر کی سُنی سنائی باتیں ہیں جو کچھ عجمی لوگوں اور کچھ یہود و نصاریٰ کے علماء سے لے کر انہوں نے کانٹ چھانٹ اور تراش خراش کے ذریعے ذرا خوشنما اور دلآویز ترتیب کے ساتھ پیش کر دی ہیں تو گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ : "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کام تو آسان تھا جو تم نے کر لیا۔ ذرا ایسے ہی کوئی ہماری پسند کا حسّی معجزہ بھی کہیں چھانٹ کر لے آؤ تو بس پھر تم کامیاب ہو جاؤ گے اور ہمارے پاس تمہارے انکار کی کوئی معقول وجہ باقی نہ رہے گی۔ تو کیوں نہیں کر گذرتے ایسا معمولی سا کام !"۔ جواباً یہاں بھی آپؐ سے وہی بات کہلوائی گئی جس کا ذکر اس سے قبل سورۂ بنی اسرائیل کے حوالے سے ہو چکا ہے کہ : "میں تو بس اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے ربّ کی طرف سے مجھ پر وحی کی جاتی ہے !"۔ یعنی معجزے دکھانا خدائی اختیار میں ہے اور میں نے خدائی کا دعویٰ ہرگز نہیں کیا۔ میں تو نبوّت و رسالت کے دیپے بھی نہ تھا اور میرے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ امانت کا یہ بارِ گراں میرے کاندھے پر ڈال دیا جائے گا، تا آنکہ حکمِ ربّانی آپہنچا اور بفحوائے الفاظِ قرآنی : "اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا !" نبوّت کا یہ بارِ گراں مجھ پر ڈال دیا گیا ——— اب میں تو خود بھی اس وحی کا پابند ہوں جو مجھ پر نازل کی جا رہی ہے اور اس کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہوں ——— اِس کے بعد مخالفین و معاندین سے صرفِ نظر فرماتے ہوئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب التفات فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کی عظمت بیان فرماتا ہے کہ اس کی آیاتِ بیّنات ہی میں اصحابِ عقل و خرد کے لئے اللہ تعالیٰ کی توحید اور آپؐ کی رسالت کی عظیم نشانیاں موجود ہیں، طالبینِ ہدایت کو ان ہی کے ذریعے جملہ حقائق تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے، اور اہلِ ایمان کے حق میں تو یہ نعمتِ بے بہا ہیں یعنی اس دنیا میں ذریعۂ ہدایت اور آخرت میں موجبِ رحمت !!

آخر میں اہلِ ایمان کو حکم ہوا کہ اس قرآن کی قدر پہچانیں اور اِس کا ظاہری و معنوی ہر طرح کا ادب ملحوظ رکھیں۔ جس کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ جب بھی کہیں اسے پڑھا جا رہا ہو تو بالکل ساکت و صامت ہو کر اس کی جانب متوجّہ ہو جائیں اور پورے دھیان اور

کامل توجّہ کے ساتھ اسے گوشِ حقیقت نیوش سے سُنیں ـــــ واقعہ یہ ہے کہ رحمتِ خداوندی تک رسائی کا اس سے زیادہ سہل اور یقینی راستہ اور کوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی قرآن حکیم کی قدر کرنے اور اُس کے جملہ حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العٰلمین!

(۴)

سُورۂ اعراف کی آخری دو آیات ۲۰۵ تا ۲۰۶ حسب ذیل ہیں:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝

(ترجمہ) "اور (اے نبی!) اپنے ربّ کو دل ہی دل میں بھی عاجزی اور خوف کے ساتھ یاد کرتے رہا کرو اور پست آواز سے بھی، صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی، اور غفلت کو قریب نہ پھٹکنے دو! بے شک جو تیرے ربّ سے قُرب رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آکر اُس کی عبادت سے مُنہ نہیں موڑتے اور (ہمیشہ) اُس کی تسبیح کرتے اور اُس کے لئے سربسجود رہتے ہیں!"

اِن الفاظِ مبارکہ پر سورۂ اعراف کا اختتام ہو رہا ہے اور اکثر مکّی سورتوں کے اسلوب کے مطابق یہاں بھی خصوصی التفات اور خطاب ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی جانب، اور اس میں خصوصی تاکید وارد ہوئی ذکرِ الٰہی اور اس پر مداومت کی!

ویسے تو بندۂ مومن کی اصل دولت اور اُس کا اصل سرمایۂ تسکین ہر حال میں ذکرِ الٰہی ہی ہے جیسے کہ خود آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ "قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ": (یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے!) گویا بقول شخصے:

حاصلِ زندگی ہیں وہ لمحے ❊ جو تری یاد میں گذرتے ہیں!

لیکن خاص طور پر دعوت اِلَی اللہ کی راہ کی مشکلات اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے راستے کے مصائب سے نبرد آزما اور عہدہ برآ ہونے کے لئے تو مومن کا واحد سہارا اللہ کی یاد ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ مُزّمّل کے آغاز میں جہاں یہ خبر دی گئی کہ: اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا (یعنی ہم آپ پر ایک بھاری ذمّہ داری ڈالنے والے ہیں!) وہیں

اس راہ کے موانع و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے ضمن میں یہ ہدایت تاکید دے دی گئی کہ: "وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا" "اور اپنے رب کے نام کی مالا جپا کرو اور ہر طرف سے کٹ کر بس اُسی کے ہو کر رہ جاؤ"۔ سورہ الم نشرح میں فرمایا: "فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ" (یعنی جب بھی دعوت و تبلیغ کی مصروفیتوں سے ذرا فراغت و فرصت ملے فوراً کمربستہ ہو جاؤ اور اپنے رب کی جناب میں متوجہ ہو جاؤ!) ——— یہ ہدایات تو بالکل ابتدائی دور میں دی گئیں، اس کے بعد جیسے جیسے تمسخر و استہزاء اور تشدد و ایذا میں اضافہ ہوتا چلا گیا، ذکرِ الٰہی کی تاکید اور اس پر مداومت کے حکم میں بھی شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔ جیسے سورۂ عنکبوت میں فرمایا: "اُتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ ۖ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ" : ("اور پڑھا کرو جو وحی کیا گیا تمہاری جانب کتاب میں سے اور نماز قائم رکھو۔ یقیناً نماز بے حیائی اور برائی کے کاموں سے روکتی ہے اور یقیناً ذکرِ الٰہی سب سے بڑی چیز ہے!")

سورۂ اعراف جس زمانے میں نازل ہوئی وہ گویا کفارِ مکہ کی مخالفت و عداوت کے عروج کا دور ہے جس میں سردارانِ قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی قرارداد پر متفق ہو چکے تھے۔ لہٰذا اس موقع پر پھر نہایت زوردار الفاظ میں اسی ذکرِ الٰہی کی تاکید فرمائی گئی ——— اور یہاں اس ذکر کے بعض آداب بھی تلقین فرما دیئے گئے جو حسبِ ذیل ہیں:

اوّلاً: یہ کہ یادِ الٰہی کا اصل محل قلب ہے۔ گویا اگر دل میں یاد ہو تو خواہ زبان نہ بھی حرکت کرے، اور آواز نہ بھی پیدا ہو ذکر کا مقصد حاصل ہو جائے گا، اور اس کے برعکس اگر دل غافل ہو تو خواہ زبان بھی تیزی سے حرکت کر رہی ہو اور آواز بھی زور و شور سے پیدا ہو رہی ہو، یہ ذکر لاحاصل رہے گا۔ گویا اصل ذکر، ذکر قلبی و نفسی ہے۔ لہٰذا پہلی بات یہی ارشاد ہوئی کہ: "وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ"!

ثانیاً: ——— یہ کہ ذکر کرتے ہوئے بندے پر عاجزی اور فروتنی اور خوف و خشیت کی کیفیات بتمام و کمال طاری ہونی چاہئیں۔ اس لئے کہ یہ اس ذکر کے لئے بمنزلۂ روح ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بندے کا تو کام ہی یہ ہے کہ اپنے خالق و مالک، آقا و

خداوند اور پروردگار و پالن ہار کے سامنے عجز و تذلّل اور تواضع و انکسار کا اظہار کرتا رہے۔ اور اس کی ہر ہر حرکت سے یہ ظاہر ہو کہ وہ آقا نہیں غلام ہے اور مالک نہیں بندہ ہے۔ پھر جہاں خاص طور پر معاملہ آقا کے حضور میں پیشی کا ہو جیسا کہ نماز یا ذکرِ الٰہی کی صورت میں ہوتا ہے تو ایسے مواقع پر تو یہ کیفیات پوری شدت سے ظاہر ہونی چاہئیں۔ چنانچہ ارشاد ہوا: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً اس مثبت اسلوب کے ساتھ ساتھ اگلی آیت میں سلبی انداز میں بھی واضح فرما دیا گیا کہ: "یقیناً جو تیرے رب کے پاس ہیں!" یعنی ملائکہ مقرّبین اُن پر اپنی تمام تر جلالتِ قدر اور علوِّ منزلت کے باوجود ہمیشہ ہی تضرّع و اخبات کی کیفیت طاری رہتی ہے اور انہیں کبھی کوئی تکبّر یا غرور و گھمنڈ لاحق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ربّ کی عبادت سے رُوگردانی کریں بلکہ وہ ہمیشہ اللہ کی تسبیح و تحمید اور تقدیس میں لگے رہتے ہیں، اور اپنے ربّ کے سامنے سربسجود رہتے ہیں۔ جیسے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ آسمانوں پر کوئی ایک بالشت جگہ بھی ایسی خالی نہیں ہے جہاں کوئی نہ کوئی فرشتہ اپنے ربّ کے سامنے سجدے میں پیشانی ٹکائے ہوئے نہ ہو۔ واضح رہے کہ لفظِ عبادت کا اصل لغوی مفہوم بھی اظہارِ عجز و تذلّل ہی ہے۔ چنانچہ مشہور امامِ لغت ابوحیان اُندلسی کا قول ہے کہ: "العبادةُ التذلّل، قالہُ الجمهور" (یعنی جمہور علماء کا اس پر اتّفاق ہے کہ عبادت تذلّل کو کہتے ہیں!)

ثالثاً یہ کہ اگر ذکر قولاً کیا جائے تو یہ بھی زیادہ بلند آواز سے نہ ہو بلکہ: "دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ!" کیا جائے یعنی دبی زبان یا پست آواز سے۔ یہی بات سورۂ بنی اسرائیل میں مزید وضاحت کے ساتھ اس طرح ارشاد فرمائی گئی کہ: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا (اللہ سے دُعا و مناجات میں نہ تو آواز کو زیادہ بلند کرو نہ ہی اُسے بالکل پست کر لو۔ بلکہ اس کے بَین بَین رَوِش اختیار کرو!) ــــــ ذکر میں زبان کو حرکت دینے اور کسی قدر آواز پیدا کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے اعضاء و جوارح اور اُس کے حواسِ ظاہری بھی اس بابرکت کام میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور بالخصوص وہ عوام النّاس جو بقول علّامہ اقبال مرحوم و مغفور "خوگرِ پیکرِ محسوس" ہوتے ہیں اور جن کے لئے بغیر کسی ظاہری اور محسوس طریقے کے

صرف دل یا جی میں ذکر کرنا مشکل ہوتا ہے ان کو اس سے دلجمعی اور یکسوئی حاصل ہوجاتی ہے۔ البتہ اس میں آواز کو زیادہ بلند کرنے سے اس لئے روک دیا گیا کہ ایک تو اس میں سُوءِ ادب ہے کہ شاید نعوذ باللہ من ذالک اللہ کو پکارنے والا اسے بہرا سمجھ رہا ہے ـــــ اور دوسرے اس میں ریاکاری اور ظاہرداری ـــ یعنی اصطلاحِ شرع میں ریا و سمعہ کا امکان بھی پیدا ہوجاتا ہے ـــ جس سے عبادت سرے سے باطل ہوجاتی ہے اور اس کا سارا اجر و ثواب ضائع ہوجاتا ہے۔

رابعاً یہ کہ یہ ذکرِ الٰہی: "بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَال" ہونا چاہیئے ـــ ان الفاظِ مبارکہ کے معنی و مراد میں دو احتمالات ہیں: ایک یہ کہ یہ بطورِ محاورہ استعمال ہوئے ہوں یعنی صبح و شام جس سے مراد ہوگی ہمیشگی اور مداومت، یعنی بندہ مومن بالخصوص داعیٔ حق کا دل اللہ کی یاد سے ہر دم اور ہر لحظہ معمور رہنا چاہیئے، اس لئے کہ اس معاملے میں وہ بات بالکل مبنی برحق ہے جو عارفِ حق نے فرمائی کہ "یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد!" ـــ یعنی ذکرِ الٰہی وہ چیز ہے جس سے ایک لحظے کی غفلت بھی بسا اوقات سو سال کی مسافت کا فرق ڈال دیتی ہے! اس مفہوم کے اعتبار سے اگلے الفاظ یعنی "وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ" اسی کی تاکید مزید اور وضاحتِ مزید کے حامل قرار پائیں گے۔ یعنی اللہ کی یاد قلبِ مومن میں ہر دم تازہ رہنی چاہیئے اور اسے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی غفلت میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے، مبادا عین اُسی لمحے شیطان وار کرے اور اس کا یہ وار کارگر ہوجائے ـــ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان لعین اپنی تھوتھنی انسان کے دل پر جمائے رکھتا ہے اور پھونکیں مارتا رہتا ہے اِلّا یہ کہ دل میں یادِ الٰہی موجود ہو۔ جب تک بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے شیطان اُس سے دُور رہتا ہے اور جونہی وہ غافل ہوتا ہے یہ اپنی تھوتھنی کو پھر اُس کے دل پر آجماتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان کی صفت "خَنَّاسٌ" ہے ـــ یعنی پیچھے ہٹ جانے والا ـــ اور پھر پلٹ کر حملہ کرنے والا!! ـــــ (ii) بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَال کے الفاظ میں سے ایک دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ ان سے فی الواقع صبح و شام کی نمازیں ہی مراد ہوں قرینہ اس کا یہ ہے کہ "غُدُوّ" واحد ہے اور صبح کی نماز بھی ایک ہی ہے یعنی

صلوٰۃ الفجر۔ اور آصال اصل کی جمع ہے۔ اور اس سے مراد شام کی نمازیں ہیں جو تعداد میں چار ہیں یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ حکمت اس کی یہ ہے کہ طلوعِ شمس سے لے کر بعد دوپہر تک کا وقت لوگوں کو اپنی معاشی دوڑ دھوپ کے لئے ایسا مل جائے جس میں کوئی وقفہ نہ ہو۔ اور سورج کے ڈھلنے کے آغاز سے لے کر رات کے تاریک ہو جانے تک کے وقت میں پے بہ پے نمازوں کے اوقات آجائیں جیسے کہ ہمارے یہاں بالخصوص سردی کے موسم میں ہوتا ہے، تب بھی روزانہ کے کام کاج میں زیادہ حرج واقع نہ ہو۔ چنانچہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوتا ہے کہ: وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ط (یعنی نماز قائم رکھو سورج کے ڈھلنے سے لے کر رات کے تاریک ہو جانے تک اور خصوصی اہتمام کرو فجر کے وقت قراءتِ قرآن کا۔ یقیناً فجر کے وقت کی قراءتِ قرآن مشہود ہوتی ہے!) — اس سے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ: "ذکرِ الٰہی" کے ضمن میں قرآن کی اہمیت سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ جہاں دوسرے تمام طریقوں اور ذریعوں کا مقصود ذکرِ الٰہی ہے، جیسے کہ ارشاد ہوا کہ:۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ! (نماز کو قائم کرو میری یاد کے لئے!) گویا نماز کا مقصود ذکرِ الٰہی ہے — وہاں قرآن خود مجسم ذکر ہے، بفحوائے الفاظِ قرآنی: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (یقیناً ہم نے ہی اس ذکر (قرآن) کو نازل فرمایا ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں!) اور: "وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ط" (اور نازل فرمایا ہم نے یہ ذکر "یعنی قرآن" آپ کی جانب تاکہ آپؐ واضح کریں لوگوں کے سامنے جو نازل کیا گیا ہے اُن کی طرف!)

الغرض سورۂ اعراف کے اختتام پر ایک جانب تو ذکرِ الٰہی اور اس کے دوام کی تاکید غایتِ فصاحت و بلاغت کے ساتھ آگئی اور ساتھ ہی اُس کے آداب و اُصول بھی نہایت اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ بیان ہو گئے، فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ وَالْمِنَّةُ — اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے ذکر کی توفیق دے، اور اپنی یاد اور دُعا و مناجات کی لذّت و حلاوت سے آشنا کرے تاکہ ہم صبح و شام جی ہی جی میں بھی، اور پست آواز سے بھی، کامل الحاح و زاری، تضرّع و انابت اور خوف و خشیّت کے ساتھ اسے پکارتے رہیں — وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

بعثتِ محمدیؐ اور بعثتِ موسویؑ

ایک تقابلی مطالعہ

سورۂ ھود کی آیات ۹۶ تا ۹۹ کی تشریح پر مشتمل ایک نشری تقریر

از : ڈاکٹر اسرار احمدؐ

سُورۃ ھُود کی آیات ۹۶ تا ۹۹ حسبِ ذیل ھیں :

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْۤا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَاۤ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ۝ یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ۝ وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّیَوْمَ الْقِیٰمَةِ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ۝

(ترجمہ) : "اور ہم نے موسیٰؑ کو فرعون اور اُس کے اعیانِ مملکت کی طرف اپنے نشانیوں اور واضح سند کے ساتھ بھیجا۔ تو انہوں نے فرعون ہی کے حکم کی پیروی کی۔ حالانکہ فرعون کی راہ ہرگز راست نہ تھی۔ چنانچہ اب وہی قیامت کے دن اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور ان کو دوزخ کی آگ میں لے جا اتارے گا اور بڑی ہی بُری جگہ ہے وہ اُترنے کی۔ اور اُن کے پیچھے لعنت لگا دی گئی اِس دُنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔ بہت ہی بُرا ہے یہ انعام جو کسی کو ملے !!"

جہاں تک نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا تعلق ہے، قرآن مجید ایک اعتبار سے پورے کا پورا آپؐ ہی کی سیرتِ طیبہ کا بیان ہے اس پہلو سے بھی کہ بقول امّ المؤمنین حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا : "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنَ !" گویا سیرت و کردار اور اخلاق و عادات کے اعتبار سے آپؐ قرآن مجسّم تھے۔ اور اِس پہلو سے بھی کہ آپؐ کے تیئیس سالہ دورِ دعوت و تبلیغ کے دوران قرآن حکیم کی آیات اور سورتوں کا نزول حالات و واقعات کی مناسبت سے ہوتا رہا، لہٰذا اگر آیاتِ قرآنی

کو ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے مرتّب کر دیا جائے تو فی الواقع آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح حیات کی صورت اختیار کر لیں گی۔

بقیہ انبیاء و رُسُل میں سے، اِس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا ہوا ہے۔ اس کا سبب بھی اغلباً یہی ہے کہ انبیاء و رُسُل کی مقدّس جماعت میں آنحضورؐ سے سب سے زیادہ قریبی مشابہت رکھنے والے حضرت موسیٰ علیہ السّلام ہی ہیں۔ چنانچہ تورات کی پیشین گوئی آنحضورؐ کے بارے میں وارد ہوئی ہے اس میں بھی آپؐ کو "مثیلِ موسیٰ" قرار دیا گیا ہے اور قرآن حکیم میں سورۂ مُزّمّل میں بھی اسی مشابہت کی طرف اشارہ ہے کہ: اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (ہم نے بھیج دیا تمھاری جانب ایک رسول تم پر گواہ بنا کر جیسے کہ ہم نے بھیجا تھا فرعون کی طرف ایک رسول کو!) ——— چنانچہ قرآنِ حکیم کی کل ۱۱۴ سورتوں میں سے ۳۷ سورتیں ایسی ہیں جن میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا ذکر موجود ہے گویا (لگ بھگ ایک تہائی تعداد) اور تقریباً چھ ہزار چھ سو آیات میں سے ۱۵۸۴ آیات، گویا کُل آیاتِ قرآنی کا لگ بھگ تیرھواں حصّہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ ان میں وہ سورتیں بھی ہیں جن میں صرف ایک ایک آیت ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا ذکر ہے، جیسے سورۂ انفال، سورۂ تحریم، سورۂ نحل اور سورۂ صف ——— ایسی بھی ہیں جو تقریباً کُل کی کُل اُن ہی کے ذکر پر مشتمل ہیں جیسے سورۂ طٰہٰ ——— اور ایسی بھی ہیں جن کا اکثر و بیشتر حصّہ ان کے حالات پر مشتمل ہے جیسے سورۂ قصص، اور ایسی بھی جن میں سب سے زیادہ نمایاں ذکر حضرت موسیٰ علیہ السّلام ہی کا ہے، جیسے سورۂ شعراء اور سورۂ اعراف۔

سورۂ ہود کی ان چار آیات میں جن کا ترجمہ آپ نے ابھی سُنا، قصّۂ فرعون و موسیٰ کا خلاصہ اور لُبِّ لباب نہایت مختصر لیکن حد درجہ جامع الفاظ میں بیان ہو گیا ہے ——— فرعون کسی خاص شخص کا نام نہیں ہے بلکہ شاہانِ مصر کا لقب ہے ——— تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر عہدِ سکندر یعنی ۳۳۲ قبل مسیح تک فراعنہ کے اکتیس ۳۱ خاندان مصر پر حکمران رہے۔ حضرت یوسف علیہ

السّلام کے زمانے میں مصر میں بنی اسرائیل کا داخلہ ۱۶۰۰ ق م کے لگ بھگ ہوا اور اس وقت مصر پہ عمالقہ یا چرواہے بادشاہ HYKSOS KINGS حکمران تھے جو اصلاً عربی النّسل تھے۔ ان کے دَورِ حکومت میں مصر میں بنی اسرائیل کو تمام سہولتیں حاصل رہیں اور چونکہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے زمانے کا شاہِ مصر ان کا بہت عقیدت مند تھا۔ لہٰذا اس کے بعد بھی ایک طویل عرصے تک مصر میں بنی اسرائیل کو پیرزادوں کی سی حیثیت حاصل رہی۔ لیکن اس کے بعد انقلاب آیا اور مصریوں نے عمالقہ کو نکال باہر کیا اور اس کے بعد سے مصر میں بنی اسرائیل پر مصائب کا دَور شروع ہوگیا، جو فراعنہ کے انیسویں[19] خاندان کے مشہور بادشاہ رعمیس دوم (RAMESIS II) کے زمانے میں اپنے عروج کو پہنچ گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی پیدائش بھی اسی کے ہی دَور میں ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی تدبیر سے ان کی پرورش کا انتظام بھی اسی محل میں کرایا۔ جس زمانے میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام اپنی جان بچانے کی خاطر مصر سے فرار ہوکر مدین میں مقیم تھے۔ اغلباً اسی زمانے میں رعمیس دوم نے جو بہت بوڑھا ہوچکا تھا اپنی ڈیڑھ سَو اولاد میں سے تیرھویں لڑکے منفتاح کو اپنی زندگی ہی میں حکومت سونپ دی تھی۔ چنانچہ جب حضرت موسیٰ علیہ السّلام مدین سے واپسی کے دوران کوہِ طور پر مخاطبۂ خداوندی سے مشرّف اور منصبِ رسالت پر فائز ہوکر بغرضِ دعوت و تبلیغ مصر پہنچے تو آپ کی پیشی جس فرعون کے دربار میں ہوئی وہ یہی منفتاح ہے جس کا دورِ حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہوکر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہوتا ہے۔

جس طرح نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے۔ یعنی ایک بعثتِ خصوصی الیٰ اہل العرب اور دوسری بعثتِ عمومی اِلیٰ کافّۃِ النّاس، یعنی پوری نوعِ انسانی کی جانب تا قیامِ قیامت ـــ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی بھی دو بعثتیں تھیں : ایک بنی اسرائیل کی جانب جو گویا ایک بگڑی ہوئی اور انحطاط و زوال پذیر مسلمان قوم تھے اور جنھیں حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے تجدیدِ ایمان، توبہ اور اصلاحِ اعمال کی دعوت دی ـــ اور دوسرے فرعون اور اُس کے اعیانِ سلطنت اور اس کی پوری قوم کی طرف جن کو آپؑ نے دعوتِ توحید و ایمان بھی دی ـــ اور جس کے سامنے یہ مطالبہ بھی رکھا کہ بنی اسرائیل کو اپنے ظلم وستم کے پنجے سے آزاد کرکے ارضِ فلسطین کی طرف مراجعت اختیار کرنے کی اجازت دے دے۔

آیات زیرِ درس میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دعوت کے متعدّد پہلوؤں میں سے اس حصّے کا ذکر خصوصیّت کے ساتھ کیا گیا ہے اس حقیقت کا کہ مصری قوم اور اُس کے سرداروں کی بدبختی اور محرومی کا سب سے بڑا سبب فرعون کی کیادی و عیاری تھی۔ جس نے پوری قوم کے عوام و خواص کی عقلوں پہ پردے ڈال دیئے اور انہیں ہر ممکن طریقے سے اپنے پیچھے لگائے رکھا یہاں تک کہ اپنے ساتھ پوری قوم کو بھی لے ڈوبا اور جہنّم کے عین کنارے پر لے جا اُتارا۔ چنانچہ جو نقشہ دنیا میں تھا وہی قیامت کے دن میدانِ حشر میں ہوگا یعنی پوری مصری قوم کے آگے آگے فرعون خود چل رہا ہوگا اور قوم گویا اس کے اشاروں پہ مارچ کرتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے چلے گی یہاں تک کہ وہ سب کے سب جہنّم میں جا داخل ہوں گے۔ اور کیا ہی بُرا انجام ہوگا جس تک وہ پہنچیں گے!

اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ واقعۃً قوموں کی تباہی اور بربادی میں اصل ہاتھ ان کے قائدین اور رہنماؤں ہی کا ہوتا ہے۔ یہی لوگ ہوتے ہیں جو عوام الناس کو اپنے پیچھے لگائے رکھنے کے لئے ہر ممکن تدبیر اور تمام ممکنہ ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی اصلاحی یا انقلابی دعوت اٹھتی ہے اور اُنہیں اپنی سیادت اور قیادت، اور حکمرانی و چودھراہٹ کے لئے خطرے کا احساس ہوتا ہے تو یہ اپنی تمام ذہانت و فطانت اور سوجھ بوجھ کی کُل قوّتوں کو بروئے کار لاکر ہر ممکن طریق پر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں اور طرح طرح کے اُشغلے چھوڑ کر اور جھوٹ موٹ کے پروپیگنڈے کے ذریعے کوشش کرتے ہیں کہ عوام النّاس داعیٔ حق سے بدظن ہو جائیں اور اُن کی بات پر کان نہ دھریں۔ چنانچہ کبھی آباء و اجداد کے دین کی دُہائی دی جاتی ہے، کبھی اپنی قومی روایات کا نعرہ لگایا جاتا ہے، کبھی نسلی و قومی عصبیّتوں کو بھڑکایا جاتا ہے، اور کبھی ڈرایا جاتا ہے کہ یہ تمہیں تمہارے ملک سے نکال باہر کریں گے اور خود قابض ہو کر بیٹھ رہیں گے ـــــ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السّلام اور فرعون علیہ ما علیہ کی سرگذشت جو قرآنِ حکیم کے دوسرے مقامات پر تفصیلاً بیان ہوئی ہے، اس میں متعدّد بار ایسے مواقع سامنے آتے ہیں کہ جیسے مصر کے خواص و عوام کے دل حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی جانب مائل ہوا چاہتے ہیں اور حق ان کی نگاہوں پر منکشف ہوا ہی چاہتا ہے کہ اچانک فرعون کی ذہانت کوئی نیا کرشمہ دکھاتی ہے۔ اور وہ کوئی نیا شوشہ

ایسا چھوڑتا ہے کہ پوری قوم کی توجّہ کسی دوسری جانب مبذول ہو جاتی ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری!

چنانچہ سوائے چند سلیم الطبع اور پاک طینت لوگوں کے پوری کی پوری قوم اندھیرے ہی میں بھٹکتی رہتی ہے اور اُس کی آنکھوں کی پٹّیاں کسی طرح نہیں کُھلتیں اور بدبخت فرعون اپنے ساتھ پوری قوم کو لے ڈوبتا ہے! مقام زیرِ درس پر قرآنِ حکیم نے اُن لوگوں کا انجام باندازِ حسرت بیان کیا ہے کہ : فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ○ : (اِن ناسمجھوں اور بے عقلوں نے فرعون ہی کی بات مانے رکھی۔ حالانکہ فرعون کی بات ہرگز راست اور درست نہ تھی!) یعنی اگر وہ ذرا بھی اپنی عقلوں سے کام لیتے اور اپنے ہوش و حواس کو فرعون کے پاس بالکل ہی گروی نہ رکھ دیتے تو انہیں صاف نظر آجاتا کہ رُشد و ہدایت اور فوز و فلاح کا راستہ وہی ہے جس کی جانب حضرت موسیٰ علیہ السّلام بلا رہے ہیں، نہ کہ وہ جس پر فرعون جمے رہنے کی تلقین کر رہا ہے۔ اس کے بعد میدانِ حشر کا نقشہ کھینچ دیا گیا کہ آج کی معنوی حقیقت اس روز متشکل ہو کر سامنے آجائے گی۔ یعنی یہ کہ فرعون اپنی قوم کے آگے آگے چلے گا اور پوری قوم اُس کے اشاروں پر مارچ کرتی ہوئی جہنّم میں جا داخل ہو گی۔

بعینہٖ یہی نقشہ سرزمینِ مکّہ میں اِن آیات کے نزول کے وقت موجود تھا، اور سردارانِ قریش، ابوجہل، ابولہب، عتبہ ابن ربیعہ، ولید بن مغیرہ اور عقبہ ابن ابی معیط وغیرہم من الکفّار والمشرکین فرعون کی روش پر چلتے ہوئے عوام کو نبی اکرم صلی اللّٰہ علیہ وسلّم سے بدظن و برگشتہ کرنے کی ہر ممکن تدبیر پر عمل کر رہے تھے ـــــ اور عوام کی ایک بڑی تعداد بھی قوم فرعون کے مانند اپنے ان سرداروں اور لیڈروں کے دھوکے اور فریب میں مبتلا ہو کر اپنی منزل کھوٹی کر رہی تھی۔ سورۂ ہود کی اِن آیات میں قوم فرعون کے دردناک انجام کے حوالے سے قریش کے عوام کو بالخصوص اور جمیع اہلِ عرب کو بالعموم متنبّہ کر دیا گیا ہے کہ وہ بھی اپنے اس طرزِ عمل سے "بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ" اور "بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ" کے مستحق بن رہے ہیں، اِلّا یہ کہ آنکھیں کھولیں اور ہوش میں آجائیں! وَاٰخِرُ دَعْوَانَآ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○

قرآن اور سیرتِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم

سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات کی تشریح پر مشتمل

مولانا سیّد وصی مظہر ندوی

مہتمم و صدر مدرّس، جامعہ اسلامیہ، حیدرآباد سندھ کی تین تقاریر

(۱)

الحمد للہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسّلام علیٰ رسولہٖ محمد الامین و علیٰ آلہٖ واصحابہ اجمعین ○

حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نقشِ قدم پر ہر مسلمان کو چلنے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے قدرتی طور پر ہر مسلمان کے دل میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ کو معلوم کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اور پیدا ہونا چاہیئے۔ یہیں سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کو معلوم کرنے کا سب سے مستند ذریعہ کیا ہے؟

اس سوال کا انتہائی حقیقت افروز جواب وہ ہے جو اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دیا تھا۔ اُن سے کسی شخص نے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت و اخلاق کے بارے میں پوچھا تو آپ نے نہایت حیرت سے خود اس پوچھنے والے سے دریافت کیا .... اَمَا تَقْرَءُ الْقُرْاٰنَ ؟ پھر خود ہی کہا : کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْاٰنُ ط (یعنی آپ کی سیرتِ مبارکہ کی مکمّل تصویر قرآن ہے!)

اُمّ المومنین رضؓ کے اِس ارشاد کی روشنی میں آج ہم نبوّت سے قبل اور آغازِ نبوّت کے وقت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کے بارے میں قرآن مجید کی صرف دو چھوٹی چھوٹی آیتوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کی صداقت پر ایک ناقابلِ انکار حجّت کی حیثیت بھی رکھتی ہیں، یہ سورۂ مدّثّر کی پہلی دو آیتیں ہیں، ارشاد ہوتا ہے:

"یا ایھا المدثر ۝ قم فانذر ۝" "اے چادر میں لپٹے ہوئے انسان! اُٹھ اور (انسانیت کو گمراہی کے نتائج سے) باخبر کر دے!"

اِن آیات کے متعلق ایک روایت تو یہ ہے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم پر آغازِ وحی میں یہی آیتیں نازل ہوئیں۔ لیکن اگر مشہور روایت کے مطابق ..... اقرأ باسم ربّک الّذی خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقرأ وربّک الاکرم ۝ الذی علم بالقلم ۝ علم الانسان مالم یعلم ۝ کو سب سے پہلے نازل ہونے والی آیات تسلیم کیا جائے تو بھی سورۂ علق کی یہ آیات محض تمہیدی ہیں۔ کارِ نبوّت کا آغاز دراصل اِن آیات سے ہوتا ہے جو سورۂ مُدثّر" کی ابتداء میں ہیں اور جو فَتْرَۃُ الوَحی (وحی کا وقفہ) کے بعد نازل ہونے والی پہلی آیات ہیں۔

اِن میں سے پہلی آیت میں حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تصویر "المدثر" کے لفظ سے کھینچی گئی ہے جو دثار کے لفظ سے بنا ہے۔ "دثار" اس بڑی چادر کو کہتے ہیں جو انسان موسم کی سختی یا کسی اور بیرونی تکلیف سے بچنے کے لئے اپنے اصل لباس کے اوپر سے لپیٹ لیتا ہے۔ اِس چادر کی خصوصیّت یہ ہوتی ہے کہ وہ بیرونی نگاہوں، خطروں اور موسم و ماحول کی سختیوں سے انسان کو بچاتی ہے۔ اور انسان کی اصل شخصیت اُس کی قوّت و طاقت، اُس کی ذہانت و فطانت، اُس کی عمر و صحّت وغیرہ اُمور اُس کے اندر مخفی رہتے ہیں۔

عربی قاعدہ کی رُو سے "مُدَثّر" اُس شخص کو کہا جائے گا جو دثار (بیرونی چادر) میں خوب اچھّی طرح لپٹا ہوا ہو۔ اب ذرا اِس بات پر غور کیجئے کہ حُضُورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو کارِ نبوّت کے آغاز میں اس خطاب سے کیوں مخاطب کیا گیا۔ اِس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے ہمیں جاہلی معاشرے کی اس حالت کا مطالعہ کرنا ہوگا جس میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سانس لے رہے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ معاشرہ فسق و فجور، فتنہ و فساد، ظلم و تعدّی، کمزور آزاری، بے حیائی و بد اخلاقی، شراب نوشی اور قتل و غارت گری اور فکر و نظر کی ہر گمراہی میں مبتلا تھا۔ ایسے بگڑے ہوئے معاشرے میں ایک صالح فطرت انسان اپنے آپ کو کتنا اجنبی محسوس کرتا ہوگا۔ بچپن میں اُس کو آوارہ بچّوں کے کھیل نہ بھاتے ہوں گے، نوجوانی میں اُس کو نوجوانوں کی دلچسپیوں سے کوئی سروکار

نہ ہوگا، بڑوں کی ہوسِ جاہ و زر اور اس ہوس میں اندھے ہو کر ایک دوسرے کے خلاف سازش اور طاقت کا استعمال، پھر اُن کی عیش پرستانہ زندگی! غرض کہ اُن کی کسی بات میں بھی تو اس کے لئے کشش نہ ہوگی۔ بالکل اس طرح جیسے آج کل ہمارے ملک کے کسی دُور دراز دیہات کا رہنے والا کوئی صالح اور متقی مسلمان پیرس یا امریکہ کی بدنامِ زمانہ تفریح گاہوں میں یکایک پہنچ جائے۔ بیچارہ اوّل تو اپنے گوشۂ عافیت سے نکلنا ہی پسند نہ کرے گا، تنہائی اور عزلت سے اُس کی دوستی ہوگی اور اگر گھر سے باہر نکلنے پر مجبور ہی ہو جائے گا تو اُس کی خواہش یہی ہوگی کہ نہ وہ کسی کو دیکھے اور نہ کوئی اُسے دیکھ پائے، نگاہیں نیچی کئے ہوئے اپنی شخصیت کو چھپائے ہوئے، سب سے بچتے بچاتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ کر اطمینان کا سانس لے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوّت سے قبل چالیس سال کی زندگی جاہلی معاشرے میں بالکل اسی طرح گذاری۔ جب آپ بچے تھے تو عام بچوں سے آپ کے ڈھنگ نرالے تھے۔ جب آپ جوانی کی ہنگامہ خیز زندگی میں داخل ہوئے تو بھی آپ اس معاشرے کے نوجوانوں سے بالکل مختلف نظر آتے تھے۔ جب آپ بڑے ہوئے تو نہ قبائلی جھگڑوں میں حصّہ لیا، نہ قریش کے دیگر محبوب مشغلوں سے آپ نے کوئی سروکار رکھا، نہ آپ نے کبھی راگ و رنگ کی محفلوں میں شرکت کی، نہ لوگوں نے آپ کو میلوں ٹھیلوں میں دیکھا، نہ آپ نے ناؤ نوش کی محفلوں میں شریک ہوئے، نہ کبھی طوافِ عُریاں کو گوارا کیا، نہ شرک و بُت پرستی کی رسوم میں کبھی آپ نے دلچسپی لی۔

اِس معاشرے میں چالیس سال زندگی گزارنے کے بعد بھی صرف گنتی کے چند آدمی آپؐ کے یارِ غار اور غمگسار تھے۔ نبوّت سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہی نقشہ کتابوں میں ملتا ہے، اور جب وحی کا آغاز ہونے والا تھا تب تو آپ بالکل ہی سب سے الگ تھلگ ہو کر کافی طویل مدّت کے لئے غارِ حرا میں جا بیٹھے اور پھر سامانِ خورد و نوش ختم ہونے پر ہی مکّہ کا رُخ کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس زندگی کی تصویر کشی اگر صرف ایک لفظ سے کرنی ہو تو بتائیے کہ کیا "المدثّر" کے لفظ سے زیادہ بہتر اور جامع کسی اور لفظ سے کی جا سکتی ہے!!

یہ تو اِس لفظ "مدّثّر" کا صرف ایک پہلو ہے۔ اِس لفظ میں ایک دوسری حقیقت

بھی چھپی ہوئی ہے، اور وہ یہ کہ چادر میں لپٹے ہوئے شخص کی شخصیت مخفی رہتی ہے۔ اُس کی صلاحیتوں، توانائیوں اور قوتوں کا کوئی اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ گویا لفظ "المدثر" اِس بات کی جانب بھی اشارہ کر رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اپنے معاشرے میں الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں۔ اُن کے اندر قوتوں اور صلاحیتوں کا وہ خزانہ مخفی ہے، جس کا کوئی اندازہ اِس جاہلی معاشرے کو نہیں ہے، جس میں آپؐ زندگی گزار رہے ہیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو چالیس برس کی عمر تک نہ قبائلی سردار کی حیثیت سے اُبھرے، نہ قریش کے صاحبِ دولت و اقتدار فرد کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ لیکن جب آپؐ نے نبوّت کے بعد دعوتِ اسلامی کا کام شروع کیا تو دُنیا نے دیکھا کہ آپ بہترین مُبلّغ، اعلیٰ درجے کے مُعلّم و مُربّی ہونے کے ساتھ ساتھ گردوپیش کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے سیاستدان، فوجوں کی بہترین رہنمائی کرنے والے قائد اور ایک نظریاتی مملکت کے بہترین سربراہ بھی ہیں۔

دیکھئے اس چھوٹی سی آیت میں جو صرف دو لفظوں پر مشتمل ہے، کس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہ صرف پورے ماضی کو ایک لفظ میں بیان کر دیا گیا ہے، بلکہ مستقبل کے امکانات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔

دوسری آیت میں اسی الگ تھلگ رہنے والی ہستی کو اچانک حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اُٹھے اور اُس کا معاشرہ جن اعتقادی گمراہیوں، اخلاقی پستیوں، اور ظلم و زیادتیوں میں ڈوبا ہوا ہے، اُس کے بُرے نتائج سے لوگوں کو آگاہ کر دے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک شخص جو شروع ہی سے اپنے معاشرے سے کٹا ہوا ہو جس کا مزاج، جس کی اُفتادِ طبع، جس کی سرشت، جس کی سیرت، جس کا کردار معاشرہ سے کوئی مناسبت نہ رکھتا ہو، اور جو چالیس سال کی عمر تک عزلت پسند اور خاموش طبع انسان کی حیثیت میں پہچانا جاتا ہو، معاشرے کی ساری گمراہیوں کو اپنی پوری جوانی کے زمانے میں خاموشی کے ساتھ دیکھتا رہا ہو، جس نے اپنے معاشرے کے خلاف کوئی لب کُشائی نہ کی ہو، وہ بھلا چالیس سال کی پختہ عمر کے بعد یکایک اپنے مزاج اور اپنی سیرت کو کیسے بدل سکتا ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے لفظ "قُم" (اُٹھ) میں کیا معجزانہ طاقت بھری ہوئی تھی کہ جو نبی

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو حکم ملا .... قُمْ فَاَنْذِرْ ! اُٹھو اور غلط روی کے بُرے نتائج سے آگاہ کردے ! — فوراً ہی آپ نے خاموشی کی چادر اُتار پھینکی اور دعوت و تبلیغ کا کام اس زور سے کرنے لگے کہ جس کی مثال دعوت و تبلیغ کی تاریخ میں ملنی محال ہے۔ حتیٰ کہ خود اللہ تعالیٰ نے بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو حدِّ اعتدال سے زیادہ مشقت برداشت کرنے سے منع فرمایا :

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى	تو شاید آپ مارے رنج کے اُن کے پیچھے اپنی جان
اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا	ہی دے ڈالیں گے۔ اگر وہ اس پیغام پر ایمان
بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا	نہ لائے !

ہمیں دنیا کی تاریخ میں اس کی تو بہت مثالیں ملتی ہیں کہ ایک شخص ابتداء ہی سے اصلاحِ معاشرہ کا کام کر رہا ہو۔ چھوٹی، بڑی اصلاحی تحریکوں میں حصّہ لے رہا ہو، اور پھر اُس نے آگے چل کر کوئی بڑا کارنامہ کر دکھایا ہو، لیکن اِس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کوئی شخص جوانی تو خاموشی میں بتا دے، لیکن اَدھیڑ عمر میں پہنچ کر اپنے معاشرے کے خلاف بغاوت کا اعلان کر ڈالے، اُس سے جنگ آزما ہو جائے اور بالآخر اُس کو بدل کر رکھ دے۔

لہٰذا اِس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے چالیس سال کی عمر کے بعد جس مہم کا آغاز کیا وہ آپ کی اپنی ایجاد کردہ کوئی تحریک نہ تھی بلکہ وہ اللہ ربّ العالمین ہی کی دعوت تھی، جس کو آپؐ نے اسی حکم سے جاری فرمایا تھا۔ لفظِ "قُم" کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو جو حکم دیا گیا تھا اُس سے قبل آپؐ کی زندگی کچھ اور تھی۔ لیکن اس لفظ کی قوّت حاصل ہونے کے بعد آپؐ کی زندگی بالکل ہی بدل کر رہ گئی۔

معاملے کو اگر اِس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں آیات نبوّت کی صداقت کی اُس دلیل کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں، جس کا ذکر نسبتاً زیادہ تفصیل سے دیگر آیات میں کیا گیا ہے مثلاً : فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (سورۂ یونس ۱۶) : "تو میں تمھارے درمیان ایک (اچھی خاصی) عمر گذار چکا ہوں، تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو !" — دوسری جگہ ارشاد ہے : مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ (سورۂ شوریٰ : ۵۲) : "(اے نبی) تم جانتے

بھی نہ تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے، اور ایمان کسے کہتے ہیں۔ لیکن یہ تو ہم ہیں کہ ہم نے اُس کو نور بنایا جس کے ذریعے سے ہم جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔" ــــ اِن دونوں آیتوں کی روشنی میں ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اِس کی وضاحت اِن شاء اللہ آئندہ صحبت میں ہوگی ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ٥

(۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ مُحَمَّدٍ الْاَمِیْنِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ٥

گذشتہ صحبت میں "سورۂ مدثر" کی پہلی دو آیتوں کی روشنی میں ہم نے حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت کے بعض پہلوؤں کا مطالعہ کیا تھا۔ اِس مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی تھی کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم اپنی صالح فطرت کی بنا پر جاہلی معاشرے سے بالکل بیزار اور اُس کی انفرادی و اجتماعی، لایعنی یا مفسدانہ، ظالمانہ یا گمراہانہ سرگرمیوں سے قطعًا لاتعلّق تھے۔

اِس مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی تھی کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نبوّت سے قبل اگرچہ عزلت اور گوشہ نشینی کی زندگی کو پسند فرماتے تھے۔ لیکن جونہی آپؐ کو "قُمْ فَاَنْذِرْ" کا حکم ملا، آپ معاشرے کی ہر گمراہی اور بدکرداری کے خلاف سرگرمِ عمل ہوگئے۔

اِن آیاتِ کریمہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت بھی واضح ہوچکی تھی کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قبل از نبوّت چالیس سالہ زندگی میں وہ قوتیں اور صلاحیتیں مخفی رہیں جن کا ظہور بعد از نبوّت ہونے والا تھا۔

ضمنًا یہ بات بھی معلوم ہوگئی تھی کہ حضورِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی قبل از نبوّت زندگی اور بعد از نبوّت زندگی میں جو عظیم الشّان فرق پایا جاتا ہے، اُس کی کوئی توجیہ اِس کے سوا ممکن نہیں کہ بعد از نبوّت آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو وہ روشنی اور قوّت حاصل ہوگئی تھی، جس کو ہم وحیِ الٰہی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

آج اپنی ہدایت و رہنمائی کے لئے یہ بات ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ایسی بگڑی ہوئی سوسائٹی اور ایسے فاسد معاشرے میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اصلاح کا نقطۂ آغاز کس

چیز کو بنایا؟ اس سلسلے میں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ کسی صحیح تعمیر کا تصور بھی اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ موجود الوقت غلط تعمیر کی بنیادوں کو نہ ڈھا دیا جائے۔ چنانچہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا کام "انذار" تھا، یعنی لوگوں کو ان خطرات سے آگاہ کرنا، جن سے وہ اپنے غلط عقائد اور غلط اعمال کی وجہ سے دوچار ہونے والے تھے تاکہ وہ اس غلط بنیادوں پر تعمیر ہونے والے نظامِ اجتماعی کی عمارت کو منہدم کرنے کیلئے آمادہ ہو جائیں۔ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قریب ترین اہلِ خاندان کو جمع کیا تو مستقبل کے اصل خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

وَاللّٰهِ لَتَمُوْتُنَّ كَمَا تَنَامُوْنَ وَلَتُبْعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُوْنَ وَلَتُحَاسَبُنَّ بِمَا تَعْمَلُوْنَ وَتُجْزَوْنَ بِالْاِحْسَانِ اِحْسَانًا وَّبِالسُّوْءِ سُوْءًا وَاِنَّهَا لَلْجَنَّةُ اَبَدًا اَوِ النَّارُ اَبَدًا وَاِنَّكُمْ لَاَوَّلُ مَنْ اَنْذَرَ بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (ترجمہ)

"خدا کی قسم تم ایک دن مر جاؤ گے، جس طرح سو جاتے ہو۔ پھر تم کو اٹھایا جائے گا، جس طرح تم جاگ جاتے ہو۔ اور پھر تم سے تمہارے اعمال کا ضرور حساب لیا جائے گا۔ تمہیں بدلہ دیا جائے گا بُرائی کا بُرائی سے اور اچھائی کا اچھائی سے، اور پھر یا ہمیشہ کی جنت ہے یا ہمیشہ کی دوزخ اور تم پہلے وہ لوگ ہو جن کو ایک سخت عذاب آنے سے قبل خبردار کر دیا گیا ہے!"

اسی طرح آپؐ نے اپنے قبیلے کو بلکہ تمام اہلِ مکہ کو کوہِ صفا کے دامن میں جمع کیا اور پھر یہ کہہ کر گفتگو کا آغاز فرمایا: اَنَا النَّذِيْرُ الْعُرْيَانُ (میں کھلا کھلا ڈرانے والا ہوں!) آپؐ نے انہیں بتایا کہ انجام سے بے خبر، جوابدہی سے بے نیاز، دنیا پرستی اور خدا فراموشی کی جس زندگی میں تم مبتلا ہو وہ محض فریب ہے اور یہ حیاتِ مستعار جب واپس لی جائے گی، تو تم کو ایک ایک چیز کا حساب دینا ہوگا۔

یہ کہنے کو منفی کام تھا، لیکن حقیقتاً وہ بھی تعمیرِ معاشرہ کے لئے ایک مثبت بنیاد فراہم کرتا تھا، اور وہ یہ کہ انسان غیر مسئول نہیں بلکہ مسئول ہے، آزاد نہیں بلکہ بندہ ہے۔ اس کے لئے فنا نہیں بلکہ بقا ہے۔

پھر انذار کے اس کام کے ساتھ ہی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ جو مثبت کام سپرد کیا گیا تھا، وہ اسی سورت کی تیسری آیت میں بیان کیا گیا ہے: "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" (اور صرف اپنے رب ہی کی بڑائی کر!)۔ اس چھوٹی سی آیت میں معانی کے وسیع مطالب

پنہاں ہیں، لیکن ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ "سَبِّحْ" کے معنی محض زبان سے سُبْحَانَ اللّٰہ کہنا ہے اور "کَبِّرْ" کے معنی محض زبان سے اللّٰہ اکبر کہنا ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً ان الفاظ کا مفہوم صرف وہ نہیں ہے جو ہم نے سمجھا ہے، دیگر الفاظ کو چھوڑیئے۔ اس وقت صرف لفظ کَبِّرْ کو لے لیجئے، اِس لفظ کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ آدمی زبان سے بھی صرف اللّٰہ کی بڑائی کا اعلان کرے، قلب میں بھی صرف اللّٰہ کی بڑائی کا یقین رکھے، دماغ سے بھی غیر اللّٰہ کی بڑائی خارج کر دے اور وہ تمام قوتیں اور طاقتیں، بت اور انسان موہوم و موجود اشیاء جو بڑائی میں اللّٰہ تعالیٰ کی ہمسری کا دعویٰ رکھتی ہوں یا جن کے بارے میں اِس قسم کا دعویٰ کیا جاتا ہو، ان سب کے مقابلے میں کلمہ "اللّٰہ اکبر" ایک اعلانِ جنگ ہے اور شعور کے ساتھ جو شخص یہ اعلان کرتا ہے، وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتا، جب تک کہ زمین پر بھی اللّٰہ کی بڑائی اس طرح قائم نہ کر دکھائے جیسی آسمانوں میں اس کی بڑائی ہے۔ بالفاظِ دیگر جب تک انسان دائرہ اختیار میں بھی اُسی رب کی بندگی کو نہ قبول کرلے، جس رب کی بندگی دائرہ جبر میں وہ کرتا ہی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ "رَبَّکَ فَکَبِّرْ" کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ اللّٰہ تعالیٰ کی فرمانروائی، بالادستی، اقتدارِ اعلیٰ اور عظمت کو قائم کیا جائے۔ اور بڑائی کے تمام جھوٹے مدعیان چاہے وہ آدمی کا اپنا نفس ہو، چاہے وہ شیطان ہو، چاہے جن ہو، چاہے بشر ہو، چاہے مرئی یا غیر مرئی مخلوق ہو، سب کی جھوٹی بڑائی کا قلع قمع کر دیا جائے۔

یہ وہ عظیم الشان کام تھا جو اس جاہلی معاشرے میں تن تنہا کسی ساز و سامان اور مادّی سہارے کے بغیر حضور صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو انجام دینا تھا۔ اور آپ نے ۲۳ سال کے مختصر عرصے میں جزیرہ نمائے عرب کے اندر اللّٰہ کی بڑائی عملاً قائم کر دکھائی۔ نیز اللّٰہ کے سپاہیوں کی ایسی جانباز فوج تیار کر دی جو اس مقصد کو لے کر اس وقت کی پوری متمدن دُنیا میں پھیل جانے کی اور اس پر چھا جانے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

قرآن مجید کی روشنی میں سیرت پاک کے اس مطالعے سے جو سبق ہم کو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مومن کے کرنے کا کام یہی ہے، یعنی دلوں میں فکرِ آخرت پیدا کی جائے، دُنیا کی بے ثباتی کا نقش بٹھایا جائے، آخرت کی کامیابی کو اصل مطلوب بنایا جائے، اور رب العزت کے سامنے جوابدہی کا یقین رکھنے والوں کی منظم کوشش کے ذریعے اللّٰہ کے

کلمہ کو سب کلموں سے بلند کر دکھایا جائے اور اللہ کے سامنے جوابدہی کا جیتا جاگتا شعور پیدا کیا جائے اور اللہ کی عظمت کے مقابلے میں ہر عظمت کو پیوندِ خاک کر دیا جائے۔

دورِ حاضر میں یہی کام ان سب لوگوں کو کرنا ہے جو مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مقابلے میں ہمارے لئے یہ کام کرنا اس لحاظ سے تو آسان تر ہے کہ آج خدا کے فضل سے دنیا میں کروڑوں مسلمان بستے ہیں جن کے پاس ہر قسم کے وسائل اور ہر طرح کا ساز وسامان موجود ہے۔ یہ سارے مسلمان اگر مل کر اللہ کی بڑائی کو قائم کرنے کا عزم کر لیں، تو باطل ایک منٹ کے لئے بھی اُن کے مقابلے میں ٹھہر نہیں سکتا۔ بلکہ سارے مسلمان تو بڑی بات ہیں، اگر صرف دس فیصد مسلمان بھی عزم و ہمت اور اخلاص کے ساتھ اس مقصد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو بڑائی کے تمام جھوٹے مدّعیوں کو بالکل آخر اللہ کی بڑائی کے سامنے سر جھکانا پڑ جائے۔

لیکن ایک لحاظ سے یہ کام آج کے زمانے میں زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں اس کام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ بیگانے نہیں بلکہ اپنے لوگ ہیں، دشمن نہیں بلکہ دوست ہیں، برا نہ مانئے!!۔ آج خود مسلمان اللہ کی بڑائی کو قائم کرنے میں سب سے بڑا روڑا بنے ہوئے ہیں۔

ہمارے اس دعویٰ پر نہ حیرت کیجئے اور نہ غصّہ بلکہ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کیجئے کہ کیا آج :

● (۱) مسلمانوں کی بھاری اکثریت اس مقصد کو سرے سے فراموش نہیں کر چکی ہے؟

● (۲) کیا مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے اس مقصد کے حصول کے بجائے بعض چھوٹی چھوٹی رسموں کے پورا کر دینے ہی کو اصل دین نہیں سمجھ لیا ہے ؟

● (۳) کیا مسلمانوں کی بھاری اکثریت آج دنیا پرستی میں مبتلا ہو کر آخرت کو فراموش نہیں کر بیٹھی ہے؟

● کیا ہم میں ہر شخص نے عملاً یا تو اپنے نفس کو، یا خاندان اور قبیلہ کو، یا قوم اور وطن کو بڑائی کا وہ مقام نہیں دے رکھا ہے جو صرف اللہ ربّ العزّت کیلئے خاص ہے؟

اِن حالات میں اگر کوئی اللہ کا بندہ اِس مقصد کے لئے اٹھتا ہے کہ دنیا کے لوگوں

کو غفلت سے چونکا کر، دنیا پرستی سے ہٹا کر بندگیٔ ربّ کی طرف بلائے اور اللہ کی بڑائی کے سامنے سر جھکانے پر آمادہ کرے تو اکثر خود مسلمان ہی اُس کے خلاف سب سے زیادہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں اور جب تک اُس کی آواز ختم نہ ہو جائے بیچارے مسلمانوں کو اس وقت تک چین ہی نہیں آتا۔ اس صورتِ حال کا علاج کیا ہے؟ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو جس کام پر مامور کیا گیا تھا اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کے اُمّتی ہونے کے لحاظ سے جس کام کی ذمّہ داری اب ہم پر ہے! (کیونکہ اب اور کوئی نبی نہیں آنے والا ہے)۔ اِس کام کو اب کیسے کیا جائے، اس سوال کا جواب بھی سورۂ مدثّر کے ابتداء ہی میں موجود ہے۔ اور اللہ ربُّ العزّت نے ہمارے لئے کام کرنے کا واضح طریق کار بھی متعیّن فرما دیا ہے۔ اِنْ شاء اللہ اس طریق کار کی وضاحت آئندہ مجلس میں پیش کی جاسکے گی۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

(۳)

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین والعاقبۃ للمتّقین والصّلوٰۃ والسلام علی سیّد المرسلین محمّد الامین وعلیٰ اصحابہ اجمعین وعلیٰ من تبعھم باحسان الیٰ یوم الدّین ۝

سورۂ مدثّر کی ابتدائی سات آیات میں اللہ تعالیٰ نے اوّلاً اس مہم کو بیان فرمایا جو نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم اور آپ کے توسّط سے آپ کی اُمّت کے حوالے کی گئی تھی یعنی آخرت کی جواب دہی کی اساس پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا نظام قائم کرنا۔

پھر اس مہم کو سر کرنے کے لئے لائحہ عمل اور طریقِ کار بھی بیان فرما دیا۔ بعد بعثت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پوری زندگی اسی لائحہ عمل اور طریقِ کار کی تفسیر و تفصیل ہے۔ آج ہم اسی لائحہ عمل کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، تاکہ ایک طرف سیرتِ نبوی کے ساتھ ہمارا تعلّق مستحکم ہو۔ دوسری طرف ہم خود بھی اِس لائحہ عمل کے مطابق کام کرنے کا عزم کریں۔

اِس لائحہ عمل کا پہلا جُز وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ ہے، جس کے لفظی معنی ہیں: "اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو!"۔ اِس کی تفسیر میں مفسّرین کے بہت سے اقوال منقول ہیں چونکہ اِن اقوال میں باہم کوئی تضاد نہیں، اس لئے وہ سب مفہوم بیک وقت بھی مراد ہو سکتے

ثیاب (کپڑوں) کے معنی کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اِس سے مراد نفس یا دل ہے۔ یعنی اپنے دل کو پاک رکھو۔ دل کو پاک رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ جس مہم کو سر کرنے کے لئے تم جاد ہے ہو، اس میں آخرت کی طلب اور اللہ کی رضا کے سوا اور کوئی مقصد تمہارے دل کو گندہ کرنے کے لئے موجود نہ ہو۔ نہ شہرت و ناموری کی خواہش، نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ، نہ اقتدار کی طلب، اور نہ کچھ اور صرف اور صرف رضائے الٰہی کا حصول تمہارا مقصود ہونا چاہیئے۔

ثیاب کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ اِس سے مراد عمل و اخلاق ہیں یعنی تمہارے اخلاق پاکیزہ ہونے چاہئیں، نہ تمہارے قول و عمل میں تضاد ہو، نہ تمہاری زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف پہنچے، نہ تمہاری سیرت و کردار میں کوئی چیز ناپسندیدہ اور گندی ہو۔

ثیاب کے بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ اِس سے مراد کپڑے ہی ہیں لیکن ان کو پاک رکھنے سے مراد یہ ہے کہ یہ حلال ذریعے سے حاصل کردہ ہوں۔ ظاہر ہے جب کپڑے جو محض جسم سے لگے رہتے ہیں، اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حلال ذریعہ سے حاصل کئے جائیں، تو پھر غذا جو جسم و روح کا حصہ بنتی ہے، اُس کو تو لازماً حلال و طیب ہونا چاہیئے۔

اِن تمام اقوال میں مشترک بات یہ ہے کہ انسان کے ساتھ جو چیز بھی کپڑوں کی طرح چمٹی رہتی ہے، اُسے ثیاب کہا گیا ہے۔ اِسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے بیوی کو شوہر کے لئے، اور شوہر کو بیوی کے لئے لباس قرار دیا ہے۔

اِس سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمہارے ساتھی اور رفیق پاکیزہ اخلاق کے مالک ہوں اور ان میں سے جو تم سے جتنا زیادہ قریب ہو اس کا اخلاق اتنا ہی زیادہ پاکیزہ ہونا چاہیئے۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ کی اس وضاحت سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کی جوابدہی اور اللہ کی بڑائی کی طرف بلانے والے کا نفس گندے جذبات سے دل بری نیتوں سے اور اخلاق ناپاک عادتوں سے پاک ہونے چاہئیں، یہی نہیں بلکہ اس کام میں اس کے ساتھی بھی اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ سیرت کے مالک ہونے چاہئیں — یہ لائحہ عمل کا پہلا جزو ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے : وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور گندگی سے قطع تعلق کرلے
اس آیت میں "گندگی" کے بارے میں اکثر مفسرین کا قول یہی ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ یعنی شرک سے بالکل دور رہو، اس سے تمہارا کوئی واسطہ اور تعلق نہ ہونا چاہیئے۔
یہ آیت دراصل پہلی آیت کی تکمیل کرتی ہے، یعنی اس آیت میں طہارت کا مثبت حکم دیا گیا ہے تو اس آیت میں اُس اصل گندگی سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، جو عقائد و اعمال میں جہاں بھی پائی جائے اس کو بالکل نجس کر کے رکھ دیتی ہے، یعنی شرک۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص اللہ کی بڑائی قائم کرنے چلا ہو، وہ شرک سے قطعاً دور رہے اس کے ساتھ کسی شکل میں مصالحت نہ کرے۔

لہٰذا خواہ کھلی کھلی مشرکانہ سوسائٹی ہو یا ایسے مسلمانوں کا وہ معاشرہ جن میں جہالت کے باعث مشرکانہ طور طریقے پھیل گئے ہوں جو شخص اللہ کی بڑائی کو قائم کرنا چاہتا ہو، اسے بہر حال کسی بھی مصلحت کی خاطر شرک سے ادنیٰ تعلق اور واسطہ بھی نہ رکھنا چاہیئے۔ یہ لائحہ عمل کا دوسرا جزء ہے، یا پہلے جزء کی تکمیل ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے : وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ۔ اس آیت کے بارے میں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں، مشہور قول یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرو مگر اس کے بدلے میں زیادہ لینے کی نیت سے نہیں۔ اگر یہ قول لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی بڑائی قائم کرنے کی مہم کو جو شخص لے کر اٹھا اُس کو خدمت خلق میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔ لیکن اس کی غرض محض اللہ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہونا چاہیئے۔ شہرت یا ناموری، مقبولیت یا عوامی تائید کا حصول یا کوئی دیگر مادی فائدہ پیش نظر نہ ہونا چاہیئے۔

مشہور مفسر مجاہد نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ بھلائی کا کام خواہ کتنا ہی کر ڈالو مگر اُسے زیادہ نہ سمجھو اور زیادہ سمجھ کر بھلائی کرنے سے رک نہ جاؤ۔
مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی بڑائی کے علمبردار کو زیادہ سے زیادہ بھلائی کرنے کے بعد بھی اس کو بہت نہ سمجھنا چاہیئے، نہ اسی پر بس کر دینا چاہیئے بلکہ اس راہ میں اپنا جان و مال سب کچھ کھپا دینے کے بعد بھی یہی سمجھنا چاہیئے کہ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ یہ لائحہ عمل کا تیسرا جزء ہے۔

آخر میں لائحۂ عمل کے چوتھے جُز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہدایت کی گئی :-
وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ "یعنی اپنے ربّ ہی کے لئے صبر کرو!"
صبر کے اصل معنی روک رکھنے کے ہیں۔ یہاں صبر کا مطلب یہ ہے کہ اس لائحۂ عمل پر کام کرتے ہوئے نہ تو جلدبازی دکھاؤ کہ فوری نتائج کے حصول کی توقع پر لائحۂ عمل کے بعض اجزاء پر عمل نہ کرو یا اُن پر عمل کرنے میں کوئی کمی کر دو نہ مشکلات سے گھبرا کر اس مقصد کو یا اس لائحۂ عمل کے کسی جُز کو چھوڑ بیٹھو، نہ کسی لالچ کے باعث اپنے مقصد سے ہٹو۔ بلکہ ہر حال میں ثابت قدم رہو۔ اور یہ ثابت قدمی محض اپنے ربّ کے لئے ہونی چاہیے یہی نہیں بلکہ اس راستے میں جو صبر درکار ہے وہ محض اللہ تعالیٰ پر ایمان ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے : وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ط
: "اور صبر کر اور نہیں تیرا صبر کرنا مگر اللہ کے ذریعے!"
بندگانِ خدا کو دُنیا پرستی سے نکال کر آخرت طلبی کی راہ پر لگانے اور غیر اللہ کی بڑائی ختم کر کے اللہ کی بڑائی قائم کرنے کے نصب العین کا حصول جس لائحۂ عمل پر موقوف ہے اس کے اجزاء چار ہیں :

۱۔ تطہیرِ قلب و نفس اور تطہیر رفقاء و انصار
۲۔ شرک سے کُلّی اجتناب (یہ اگرچہ پہلے جُز ہی کا حصّہ ہے لیکن اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے!)
۳۔ کسی مادّی صِلے کی توقع کے بغیر خدمتِ خلق یا مسلسل جِدّ و جُہد۔
۴۔ محض اللہ تعالیٰ کی خاطر صبر و ثبات۔

حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیّبہ کا اب تفصیلی مطالعہ کریں گے تو لائحۂ عمل کے ان چاروں اجزاء پر آنحضرت کے عمل پیرا ہونے کی تفصیلی کیفیّت معلوم ہوگی اور ہم میں سے ہر شخص اپنے اپنے ماحول میں اپنے نصب العین کے حصول کیلئے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ لائحۂ عمل کو اختیار کرنے کی صورتیں معلوم کر سکے گا۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

انقلابِ محمدی

علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

کا استحکام اور اس کی توسیع

از : مولانا سیّد حامد میاں مدظلہٗ
مہتمم و شیخ الحدیث ، جامعہ مدنیہ ، لاہور

جس طرح زاویے اور سامان کی ترتیب بدل کر ایک چھوٹے سے کمرے کے بہت سے فوٹو تیار کیے جا سکتے ہیں، اسی طرح اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے بحرِ بیکراں پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار و بے نہایت مسائل و فوائد موجود نظر آئیں گے اگر بڑے سے بڑے عالم کی پوری علمی قوت حیاتِ طیبہ کے ایک ایک گوشہ پر صرف ہو تو اس کا علم اور اس کی عمر کے تجربات اس بحرِ بیکراں کے مقابلہ میں بالکل ہیچ نظر آئیں گے ———— !!

جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے وقت فقط ملکِ عرب کے حالات پر نظر ڈالنا کافی نہیں ہے، بلکہ ساری دنیا کے حالات پر نظر ڈالنی چاہیئے کیونکہ آپؐ نبی عرب نہیں بلکہ نبی عرب وعجم تھے، نبیِّ بنی نوعِ انسان تھے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ } وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ٥

دیکھنا یہ چاہیئے کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت پوری دنیا میں اخلاق و کردار کی کیا حالت تھی۔ چھٹی صدی عیسوی جس کے آخری حصّہ میں یہ آفتاب طلوع ہوا ایک اندھیری رات تھی، جس پر گمراہیوں اور ظلم وستم کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ دولت پر غرور، جاگیر و جائیداد پر گھمنڈ، نسلی اور خاندانی اُونچ نیچ، اپنے آپ کو اُونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھنا یہاں تک کہ ان سے چھوت چھات کرنا، غریبوں کو دبانا، کمزوروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا، عورتوں کو ایک خدمت گذار جاننا، شوہروں کے مرنے کے بعد ان کی زندگی کو اکارت

ماننا، یہاں تک کہ اُن کی خودکشی کو اُن کے لئے ذریعۂ نجات سمجھنا، خدا کا انکار کرنا۔ یا سینکڑوں، ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے سامنے ماتھا رگڑنا، من مانی باتوں کو مذہب اور دھرم سمجھ لینا، خود غرضی، بے رحمی، سُود، زنا، شراب، رشوت، جُوا وغیرہ ایسی بیماریاں تھیں جن کی وَبا پُوری دُنیا میں پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت کی مہذّب دُنیا وسط ایشیا، ایران، ہندوستان، یا مشرقی یورپ تک ہی محدود تھی۔ باقی مغربی یورپ اس زمانہ میں تہذیب و تمدّن سے اتنا بعید تھا کہ شہروں اور قصبوں کی باقاعدہ آبادیاں بھی نہیں تھیں۔ ایک ہی جیسی جھونپڑیوں یا پہاڑی گھاٹیوں میں انسان اور ان کے مویشی ساتھ ساتھ رہتے تھے، فرق بہت معمولی ہوتا تھا افریقہ میں کچھ عرصہ پیشتر تک بھی ایسے نمونے ملتے تھے۔ اور امریکہ تو صرف چار سَو سال سے انسانی ممالک کے زُمرے میں داخل ہوا ہے۔

عرب میں قبائلی زندگی تھی، اُن کی فطرت جنگجو تھی۔ وہ ایک بڑے آدمی کے قتل کے بدلہ میں بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ اُس کا خون بہا بھی عام آدمی کی دیت سے زیادہ ہوتا تھا۔

اِن حالات میں جناب رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے۔ آپ نے صحیح عقائد بتلائے، اچھے اعمال سکھلائے، اخلاقِ فاضلہ کی تعلیم دی۔ تمام مسلمانوں کو مساوات کا سبق سکھایا، غریب پروری کی روح پھُونک دی۔ حتّٰی کہ اِنفاق اور ایثار اِس قدر عام ہوا کہ اس کی مثال ملنی ناممکن ہے۔ استحصال کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ تمام معاملات صداقت و عدالت و انصاف کا بہترین نمونہ ہوگئے۔ جنھیں دیکھنے والے کافر بھی واسطہ پڑنے پر اور تھوڑا بہت میل جول بڑھنے پر داخلِ اسلام ہوجاتے تھے۔

قرآنِ کریم میں شہنشاہیت، ڈکٹیٹرانہ شان اور آمرانہ طرزِ حکومت کی مذمّت کی گئی ہے۔ فرعون کا ذکر جا بجا فرمایا گیا ہے، اور شورائی نظام کی تعریف فرمائی گئی۔ جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اسے اپنا کر اس کی بنیاد ڈالی۔ ارشاد ہوا: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (پ۴)

خزانے پر خزانے جمع کرنے اور ذخیرہ اندوزی اور استحصال کی مذمّت کی گئی ہے۔ یہ معاشرتی خرابیاں انسان کی فطری کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی اصلاح کا عزم کرلے تو اصلاح

ہوجاتی ہے۔ اس لئے انہیں نیا نہیں کہا جاسکتا۔ اگر مالدار ہونے کے باوجود نیویارک جیسے عظیم مادّی ترقی کے مظہر شہر میں صرف چند گھنٹے بجلی غائب ہونے پر ہر آدمی ڈاکو بن سکتا ہے تو اُس زمانہ میں قریش میں بھی اس کی مثالیں تھیں۔ اگر آج غریبوں کا استحصال ہو رہا ہے تو یہ بات بھی نئی نہیں، اُس زمانہ میں بھی ایسا ہوتا تھا۔

والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی تصنیف سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ میں ان حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ مقامی اور سماجی حالات کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

۱۔ عرب میں بادشاہت نہیں تھی، ہر ایک قبیلہ آزاد ہوتا تھا۔ شیخ قبیلہ اندرونی نظام کا نگران ہوتا تھا۔ مکّہ میں اس نظام نے چھوٹے سے جمہوریہ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صدرِ جمہوریہ تو پھر بھی کوئی نہیں تھا، البتہ قبائل کی ایک مشترک جماعت کونسل تھی۔ اس نے شہری، سماجی اور انتظامی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر تقریباً ایک درجن شعبے (پورٹ فولیو) بنائے تھے۔ اور ہر شعبہ کا سربراہ منتخب کر دیا تھا۔ مثلاً مقدّماتِ قتل کا ایک خاص شعبہ تھا۔

اس کے سربراہ ابو بکر صدّیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے، شعبۂ سفارت کے ذمّہ دار حضرت عمر فاروق رضؓ تھے۔ اسی طرح باقی شعبوں کے ذمّہ دار علیحدہ علیحدہ تھے۔ اِن میں سے صرف ابو بکر صدّیق رضؓ وہ تھے جو سب سے پہلے اسلام لائے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ کئی سال بعد مسلمان ہوئے۔ باقی شعبوں کے ذمّہ دار یا مسلمان ہی نہیں ہوئے، یا اگر مسلمان ہوئے تو بہت بعد میں۔

اس مشترک جماعت کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اس مقام کا نام "دار الندوہ" تھا جہاں یہ اجلاس ہوا کرتے تھے۔ کوئی غیر معمولی معاملہ ہوتا تو اراکین کے علاوہ بھی نمایاں افراد کو خاص طور پر مدعو کر لیا جاتا تھا۔

۲۔ حرب بن اُمیّہ، ولیدہ بن مغیرہ، عاص بن وائل، عتبہ بن ربیعہ، ابولہب، ابوجہل، امیّہ بن خلف، ابی بن خلف، عقبہ بن ابی معیط، نضر بن حارث، اسود بن عبد یغوث بڑے بڑے دولت مند تھے۔ یہ تاجر بھی تھے، صاحبِ جائداد بھی۔ سودی کاروبار بھی بڑے پیمانہ پر کرتے تھے اور ان تمام خصوصیتوں کے مالک تھے، جو سرمایہ داروں میں ہوا کرتی ہیں۔ مثلاً ابولہب جو آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا چچا بھی تھا اور ہمیشہ مخالفت میں پیش پیش رہا۔ اس کا سودی لین دین وسیع پیمانے پر تھا اور اس کے حرص و طمع کی یہ حالت تھی کہ اس نے

خانہ کعبہ کے خزانہ سے سونے کا ہرن چوری کر کے بیچ ڈالا تھا۔ یہ ہرن بہت عرصہ سے محفوظ چلا آتا تھا[1]۔ عاص بن وائل بہت بڑا دولت مند اور اپنے قبیلہ کا مشہور سردار تھا۔ مگر حضرت خبابؓ سے اس پر جھگڑا ہوا کہ انہوں نے لوہے کی کوئی چیز بنا کر اس کو دی تھی۔ وہ اس کی اُجرت مانگتے تھے اور یہ جان چُراتا تھا۔ یہی عاص بن وائل تھا جس نے یمن کے ایک تاجر کو اس لئے مار پیٹ کر بھگا دیا تھا کہ اس نے اپنے دام مانگے، جس سے تمام مکّہ والوں کی بدنامی ہوئی۔

قرآن شریف نے کسی کا نام نہیں لیا، مگر اُس کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرہ کا اُونچا طبقہ جو مکّہ پر چھایا ہوا تھا، جو اس لحاظ سے خوش نصیب مانا جاتا تھا کہ ان کے یہاں دولت کے انبار بھی ہوتے تھے اور فرمانبردار اولاد کی بھی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے اخلاق اور اوصاف یہ تھے :

● الف : اپنی اس خوش نصیبی پر کہ وہ صاحبِ مال اور صاحبِ اولاد ہیں، ان کو گھمنڈ اور غرور ہوتا تھا۔

● ب : جو اُن سے کم ہوتے تھے، اُن کو حقیر سمجھتے اور طرح طرح کے طعنے دیتے تھے ——————!!

● ج : اپنے اثر و رسوخ اور اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے جھوٹی قسم کھانے سے اُن کو عار نہ آتی تھی بلکہ بڑھ چڑھ کے قسمیں کھاتے۔ دوسروں کو لڑانے اور اپنے مخالفوں کو زک پہنچانے کے لئے بے دھڑک چغلیاں اور طرح طرح کا شرارت آمیز پروپیگنڈہ کرتے تھے۔

● د : کمزور پر ظلم کرنا اُن کی عادت تھی۔

● ہ : نرم مزاجی اور اخلاق سے ناآشنا تھے۔ نیک کام نہ خود کرتے نہ دوسروں کو کرنے دیتے۔

● و : غریبوں کی امداد کا کوئی موقع ہوتا تو اُس میں روڑے اٹکاتے، نہ خود خرچ کرتے نہ دوسروں کو خرچ کرنے دیتے۔

● ز : اخلاق سے ناآشنا، سخت دل، خشک مزاج، طبیعت کے رُوکھے

● ح : رات دن تجوری بھرنے کی کوشش میں مصروف رہتے۔ اِس تصوّر سے ناآشنا

---

[1] معارف ابن قتیبہ

تھے کہ یہ دولت ختم ہونے والی بھی ہے۔

ط : خدا سے بے تعلق، خدا پرستی سے بیگانہ، کج بحث، زبان زوری سے اپنے عیبوں کو چھپانے والے۔

یہی لوگ تھے جو پورے مکہ پر چھائے ہوئے تھے، اور چونکہ مکہ ہر لحاظ سے پورے عرب کا مرکز تھا تو ان کے اثرات پورے عرب پر غالب تھے۔ ایک شخص جس نے بچپن، جوانی اور اُدھیڑ عمر کا ایک حصہ شہر کی کھلی ملی زندگی میں اِس طرح گذارا ہو کہ وہ لوگوں کی آنکھ کا تارا بنا رہا ہو۔ اُس کی زندگی میں خاص طرح کی تبدیلی آئے، اُس کے کچھ ساتھی ہو جائیں، اُن میں وہ بھی ہوں جو شہری زندگی میں اونچا درجہ رکھتے ہوں۔ (جیسے ابو بکرؓ) کچھ مالدار گھرانوں کے نوجوان ہوں (جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور مصعب ابن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنھم) اور یہ سب ایک خاص قسم کی انقلاب انگیز زندگی بتانے لگیں۔ ماں بیٹے یہ کسی کو اپنی طرف نہیں بلاتے مگر کیا خود ان کا عمل اور غیر معمولی انداز لوگوں کو متوجہ نہیں کرے گا۔ خصوصاً وہ بڑے لوگ جو اپنے اقتدار کو سنبھالنے کے لئے ہر خطرہ کے موقع پر خود دین سے کام لیتے ہیں۔ کیا وہ اُن کے طرزِ زندگی سے ہراساں اور چوکنے نہیں ہوں گے۔ اور کیا یہ بات اُن کو سراسیمہ اور پریشان نہ کر دے گی کہ یہ جماعت جس طرح شرک اور بُت پرستی کے خلاف توحید کی قائل اور خدا پرستی کی عاشق ہے۔ وہ سرمایہ دارانہ نظامِ حیات سے بھی اتنی متنفر ہے، اور جذباتِ نفرت کی پرورش کر رہی ہے۔

ردِّ عمل : یہ قدرتی بات تھی کہ سردارانِ قریش نے جیسے ہی اس چھوٹی سی جماعت کے انداز سے خطرات کو بھانپا، مخالفت شروع کر دی مگر جس طرح دعوت عام نہیں تھی، مخالفت بھی عام نہیں تھی۔ نجی مجلسوں میں تبصرے ہوتے۔ بے شک پھیلنے والے اثرات کو زائل کیا جاتا، اور مخالفانہ رائے پختہ کی جاتی تھی۔ مگر گفتگو اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ مثلاً سب سے پہلے قرآن پاک کی معجزانہ فصاحت و بلاغت تھی جو ہر ایک صاحبِ ذوق کو متاثر کر دیتی تھی۔ اور جب کوئی صاحبِ فکر معنی اور مقصد پر غور کرتا تو حیران رہ جاتا۔ اور بسا اوقات وارفتہ ہو جاتا تھا۔ یہ وارفتگی گرویدگی کی حد تک پہنچتی تھی، جو اس کو سب سے چھڑا کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ کر دیتی تھی۔ جو حضرات اب تک مسلمان ہو چکے تھے اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی تھی مگر وہ قرآن پاک کی اس تاثیر کی بہترین مثال اور

نمونہ تھے۔ قرآن پاک کی اس تاثیر کو معاذ اللہ جادو کہا جاتا تھا، کہ یہ منتر ہے جو کسی طرح "محمدؐ" (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہاتھ لگ گیا ہے۔ وہ اس منتر سے متاثر کرتا رہتا ہے۔

اِن آیتوں اور سورتوں میں جن عقائد اور نظریات کی تلقین کی ہے، جب اُن پر بحث ہوتی تو بڑے لوگوں کا چلتا ہوا جواب یہ ہوتا تھا: "پرانے زمانہ کی دقیانوسی باتیں ہیں، اب زمانہ بدل گیا ہے، اب یہ باتیں نہیں چل سکتیں۔ جب خدا پرستی اور توحید کا ذکر ہوتا تو جواب دیا جاتا اپنے باپ دادوں کے مذہب سے ہٹ کر گمراہ ہو رہے ہیں جب اُن کی شب و روز کی عبادت، اور غیر معمولی شب بیداری کا تذکرہ ہوتا تو رؤساءِ قریش کی مجلسوں میں تبصرہ یہ کیا جاتا: "دیوانے ہو گئے ہیں!" لیکن ظاہر ہے اس طرح کے جوابات وقتی طور پر کام کر سکتے ہیں۔ واقعی اور حقیقی اثرات کو زائل اور سوال کرنے والوں مطمئن نہیں کر سکتے۔ تو اب ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اس سے پہلے کہ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اثرات متعدی ہوں، ان سے کوئی سمجھوتا ہو جائے۔ چنانچہ سردارانِ قریش کا ایک وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ارکانِ وفد پر ایک نظر ڈال لیجئے:

۱۔ ولید بن مغیرہ۔ مکہ کا رئیسِ اعظم جو دولت مندی اور خوشحالی کی تمام عظمتیں اپنے اندر رکھتا تھا۔ اِسی وجہ سے اُس کو "وحید" کہا جاتا تھا۔

۲۔ ابوجہل۔ سب سے زیادہ ہوشیار اور چالاک سردار۔

۳۔ اسود بن عبد یغوث۔ مکہ کا بہت بڑا تاجر اور رئیس۔

۴۔ اخنس بن شریق۔ طائف کا سب سے بڑا سردار اور رئیس۔

وفد نے آپ کے سامنے تین صورتیں پیش کیں:۔

- اگر دماغی غلش ہے تو اجازت دیجئے ہم بہترین علاج کا انتظام کریں۔
- اگر عیش و عشرت مقصود ہے تو ہم دولت اور حسن دونوں فراہم کر سکتے ہیں۔
- اگر اقتدار مطلوب ہے تو مکہ کے اقتدار کی باگ ڈور آپ کے حوالے کرتے ہیں۔ مگر آپ اپنے انداز کو ہلکا کیجئے، آپ کے نظریات جو سننے میں آرہے ہیں، نہایت سخت ہیں۔ وہ ہیجان برپا کر دیں گے ——— مگر وحی الٰہی نے اس طرح کی پیشکشوں کی تردید کر دی۔ (سیرۃ مبارکہ ص: ۷۹ تا ۸۵) اسلام نے ذاتی ملکیت کا خاتمہ تو نہیں کیا مگر مسلمان کے پاس چھوڑا بھی کچھ نہیں۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی خاصی تعداد زکوٰۃ

دیتی ہے۔ مال کا اتنا حصّہ تو وہ دینے کے عادی ہیں۔ اگر اسلامی نظام ہو تو سب پر اس نظام کے قیام کے لئے خرچ کرنا مزید ضروری ہوگا۔ اس خرچ کی کوئی مقدار نہیں :۔ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ۔ اور یہ خرچ جہاد کی طرح ضروری ہوگا۔ جہاد کی بہت سی آیات میں مال کا لفظ انفس کے لفظ سے پہلے لایا گیا ہے۔ جابجا ارشاد ہے : جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ۔ اسلام کے لئے دفاع اور گہوارۂ اسلام کی بقاء دونوں ہی ضروری ہیں۔ حتیٰ کہ فرمایا گیا : اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط۔ اس قسم کی آیات و تعلیمات کی رُو سے ایک مسلمان کارہائے خیر میں اور ملکی مصالح کی خاطر بے دریغ خرچ کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ اسلام میں ایسی پیداوار اور ذرائع پیداوار گورنمنٹ کی ملک ہوں گے کہ جن کے نفع و نقصان کا عام پبلک سے تعلّق ہو۔ تاکہ دولت کی گردش چند ہاتھوں ہی میں نہ محصور ہو کر رہ جائے : کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔ مثلاً بڑے کارخانے جن کی مشینیں گورنمنٹ منگا کر دیتی ہے اور اُن کے لئے اندرونِ مُلک اور بیرونِ مُلک قرض کا بار اُٹھاتی ہے۔ یہ سب گورنمنٹ کے ہوں گے اور اُن کی آمدنی کا مصرف ملک کے عوام ہوں گے۔ یہ انقلاب بھی اسلام لایا ہے۔ ہمارے ملک میں ماضی میں یہ ہوتا رہا ہے کہ گورنمنٹ اپنے بینک سے ایک شخص کو قرض دیتی ہے، اور باہر سے اُسے مشین منگا کر دیتی ہے۔ پھر اُس کارخانہ کو اُس کی ذاتی ملکیت تسلیم کرتی ہے۔ حالانکہ یہ روپیہ عوام کا تھا اور بین الاقوامی زرِ مبادلہ کا بار ساری قوم پر آرہا ہے۔

ایسے تمام ذرائع پیداوار اور زمینوں کے بارے میں سیّدنا فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل اور فیصلہ سامنے رکھنا ہوگا۔ آپ کے زمانہ میں عراق فتح ہوا۔ فتح عراق کے سلسلہ میں "معرکۂ قادسیہ" بہت سخت اور فیصلہ کُن تھا۔ مفتوحہ علاقوں کے متعلق جو دستور اب تک رہا تھا، اس کی بناء پر جنگِ قادسیہ کی کامیابی کے بعد ایک رائے یہ تھی کہ مفتوحہ علاقہ مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے لیکن فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ملک کی تعمیر و دفاعی خصوصاً عوام کی معاشی ضرورتوں کا سوال تھا۔ کہ اگر مفتوحہ علاقہ مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے تو جاگیردار تو بہت سے ہو جائیں گے، جن کی جائیدادیں نسلاً بعد نسلٍ ان کی اولاد میں تقسیم ہوتی رہیں گی۔ مگر ان کے علاوہ دوسرے لوگ خصوصاً بعد کی نسلیں خالی رہ جائیں گی۔

لہٰذا آپ کی رائے یہ ہوئی کہ تقسیم کے بجائے اِن اراضی کو "خزانہ" بنا دیا جائے جس کو سب تقسیم کرتے رہیں گے۔ آپ نے سب کی رائے سُن کر گفتگو فرمائی اور سورۂ حشر کی آیات سے استدلال فرمایا۔ جن میں ایک آیت میں: كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ۔ آتا ہے، اور فیصلہ فرمایا: قَدْ رَأَيْتُ اَنْ اَحْبِسَ الْاَرْضَ الخ میری رائے ہے کہ زمین کاشتکاروں کے پاس رہنے دوں، اُن پر زمینوں کا خراج مقرر کر دوں اور جو کاشت کریں اُن پر جزیہ لگا دوں۔ آپ عوام کی خوشحالی کے منصوبے سوچتے رہتے تھے۔ ایک دفعہ وفات سے کچھ ہی قبل ارشاد فرمایا: لَئِنْ بَقِيْتُ الخ اگر میں زندہ رہا تو عراق کی بیوہ عورتوں کو ایسا کر دوں گا کہ میرے بعد کسی اور امیر (کے فرمان یا پروانہ) کی اُن کو ضرورت نہ رہے گی۔ (اسلام کے سیاسی اور اقتصادی مسائل صـ۱۸۲)

(نوٹ: تیل کے چشمے وغیرہ ایسے ذرائع آمدنی میں داخل ہیں جو حکومت کے ہوتے ہیں۔ اسلام کا نظامِ مالیات خود ایک مستقل موضوع ہے، مجھے ایک آدھ مثال ہی دینی تھی!)

● والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے:

اس نظام کی بنیادیں اتنی مضبوط تھیں کہ شدید خانہ جنگی کے باوجود خوشحالی کا دَور دَورہ رہا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت یعنی خلافتِ راشدہ کے تیس سال ختم ہونے کے بعد اگرچہ وصول اور خرچ کے بارہ میں وہ احتیاط باقی نہیں رہی تھی، مگر جو اقتصادی ڈھانچہ قائم ہو چکی تھی وہ قائم رہی۔ جس کی ایک مثال یہ تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے تقریباً ستاون ۵۷ سال بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز (المتوفّٰی رجب ۱۰۱ھ مطابق ۷۲۰ء) نے نظامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیا، تو آپ نے عبدالحمید بن عبدالرحمٰن (گورنر عراق) کو حکم بھیجا کہ وظائف مقررہ ادا کریں۔

گورنر صاحب نے تعمیلِ حکم کے بعد رپورٹ بھیجی کہ تمام وظائف ادا کئے جا چکے ہیں، تب بھی کافی رقم باقی ہے۔ دربارِ خلافت سے حکم صادر ہوا، آپ کے صوبہ میں جتنے مقروض ہیں اُن کا جائزہ لو اور اُن سب کے قرض ادا کر دو جو فضولخرچی کی بنا پر مقروض نہ ہوئے ہوں۔

گورنر صاحب نے تعمیل کے بعد رپورٹ بھیجی کہ سب مقروضوں کے قرض ادا کئے جا چکے ہیں تب بھی رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جن نوجوانوں کے نکاح نہیں ہوئے، اُن کے نکاح کرا دیجئے اور مہر اس رقم سے ادا کر دیجئے۔ گورنر صاحب نے اِس حکم کی تعمیل کے

بعد بھی یہی رپورٹ بھیجی کہ رقم باقی ہے۔ حکم صادر ہوا جو غیر مسلم کاشتکار جزیہ ادا کرتے ہیں، اُن کا جائزہ لیجئے۔ اُن کو تقاوی کی ضرورت ہو تو اُن کو تقاوی دے دیجئے کہ وہ آسانی اور سہولت کے ساتھ زمین بو سکیں۔ (حاشیہ سیرۃ مبارکہ ص۵)

کہنا یہی ہے کہ مذکورۃ الصدر اصول جو اسلام کے انقلابی اُصولوں میں سے چند ہیں۔ جب تک اسلامی حکومتیں رہیں اور وہ یورپین طاقتوں کے زیرِ اثر نہ آئیں۔ اس وقت تک ان کے خلفاء و سلاطین اُصولاً نظامِ اسلام ہی کے پابند رہے اور عدلیہ بھی اسی پر چلتی رہی۔ حکّام غلط قسم کے بھی آتے رہے ہیں۔ لیکن اُن کی ذاتی خامیاں اس نظام پر اثر انداز نہیں ہوئیں۔ یہ تو ماضی میں اس انقلاب کی مضبوطی اور استحکام تھا۔

اسی نظامِ اسلامی میں سے صرف روٹی کپڑا اور مکان تو اسلامی معاشرت کے فقط چند اجزا ہیں۔ کیونکہ جو معاشرت اسلام کی مہیّا کردہ تھی، اُس میں عزّتِ نفس، حفاظتِ جان، بقائے غیرتِ نفس، بقاءِ حقوقِ رشتہ داری و قرابت وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں۔

انقلابِ محمّدی (اسلامی انقلاب) کے آئندہ استحکام کی صورت | ایمان، اعمالِ ایمانی، اخلاقِ ایمانی، عدل، تقویٰ، اسلام کا نظامِ معاہدات اور اس کا نظامِ جہاد۔ ان پر اگر ہم پھر گامزن ہو جائیں تو اس انقلابِ محمّدی یعنی اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی اور اُس کی برکات آنکھوں سے نظر آئیں گی۔ بے شک اسلام میں تعزیرات بھی ہیں اور ہم ایک دین سے ناواقف کو تعلیمات و فرائضِ اسلام میں صرف نماز، زکوٰۃ، اور تعزیرات کی سیر کراتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اپنی عدلیہ کو جو درحقیقت نظامِ اسلامی کا محور ہوتی ہے، ہم سامنے نہیں لا رہے نہ ہی اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آرہا ہے۔ جس کا نفاذ کچھ بڑی بات نہیں۔۔۔ اسلام عوام کے لئے کمیونزم سے بہت زیادہ دلکش ہے۔ لیکن اس کے فوائد اس وقت ہی سامنے آسکتے ہیں، جب وہ مکمّل طور پر نافذ کیا جائے۔ کیونکہ وہ خود مکمّل ضابطۂ حیات ہے۔ وہ دوسرے نظاموں میں مخلوط کر کے نہیں لایا جا سکتا۔

اگر ہم واقعی خلوصِ دل سے اسلامی نظام لانے کے خواہش مند ہوں اور اسے مکمّل شکل میں لے آئیں تو دنیا میں کمیونزم فنا ہوتا چلا جائے گا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

۲۳ رنومبر ۷۶ء — حامد میاں عفی عنہ

نبی اکرمؐ اور مکارمِ اخلاق

از: پروفیسر حافظ احمد یار صاحب
شعبۂ علوم اسلامی، جامعہ پنجاب

کوئی شخص ہو یا جماعت، تحریک ہو یا واقعہ، اُس کے مقصد اور اس کی اہمیّت میں ایک ایسا تعلق ہوتا ہے کہ بعض دفعہ مقصد سے اہمیّت پر استدلال کیا جا سکتا ہے اور بعض دفعہ اس کی اہمیّت کے پیشِ نظر اُس کے مقاصد کی تلاش کی جاتی ہے۔ سیرت کانفرنسوں، جلسوں (جلوسوں کو چھوڑیئے) تقریروں اور مقالوں کی اہمیّت کیا ہے؟ کیا یہ اہمیّت مقرّرین حضرات کی ذاتی وجاہت اور شخصی شہرت میں پوشیدہ ہے؟ یا تقریر کے لذیذ انداز سے حاصل ہونے والی "پاکیزہ ذہنی تفریح" میں — یہ بھی ممکن ہے کہ مقرّر کے لئے اس کی اہمیّت کسی اور مقصد کے اعتبار سے ہو اور سامعین کے لئے کسی دوسرے سے۔ تاہم بظاہر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کانفرنسوں اور تقریروں کی اہمیّت اس لئے ہے کہ اپنے مقصد کے لحاظ سے یہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت پاک کے مختلف گوشے پیش کر کے مسلمانوں کے دل میں پیغمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت اور نتیجۃً محبّت پیدا کرنے اور عمل میں سُنّت کا رنگ بھرنے کی ایک کوشش ہے اور شاید محترم ڈاکٹر صاحب یہ بھی کہہ سکتے ہیں ؎

تا تو بیدار شوی، نالہ کشودم ورنہ — عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

آقائے دوجہاں صلّی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت اور بعد از خدا بزرگی و فوقیّت کا اقرار تو ایک مسلمان کے ایمان و یقین کی بنیاد ہے۔ اور اس معاملے میں نکتہ ہائے دقیق سے سادہ دلانہ یقین زیادہ بہتر ہے، تاہم پیچ و تابِ خرد میں بھی ایک "لذّتِ دگر" ہے اور شاید یہ کانفرنسیں اور تقریریں اِس پہلو سے بھی قابلِ توجّہ ہو سکتی ہیں۔ نبی اکرم صلّی اللہ

علیہ وسلّم کی عظمت اور اہمیّت تو تاریخ انسانی کے کسی بھی طالب علم سے نہ پوشیدہ رہ سکتی ہے، نہ رکھی جا سکتی ہے۔ سوال صرف یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس عظیم ترین شخصیّت کا مقصدِ حیات کیا تھا؟ اور اس سوال کے غلط یا درست جواب پر ہی ایک غیر مسلم کے آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کا انکار کر دینے یا آپؐ پر ایمان لانے کا دار و مدار ہے۔

یہی سوال ہمارے سامنے بحیثیّت مسلمان ہونے کے یوں آتا ہے کہ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت و نبوّت کا مقصد کیا تھا؟ اور اس سوال کے جواب اور اس مقصد کے تعیّن پر ہی ایک مسلمان کے ایمان و اسلام کے زوال یا کمال کا انحصار ہے۔

(۱) کیا آپؐ کا مقصد محض ایک اچھی (نیک لوگوں کی) حکومت قائم کرنا تھا؟

(۲) کیا آپؐ کا اصل کام غریب و امیر کے فرق کو مٹا دینا تھا؟

(۳) کیا آپؐ کا بنیادی کام شفاعت کے زور پر بدکاروں اور گنہگاروں کو اللہ میاں کے "تھانے" سے چھڑا لے جانا تھا؟

(۴) کیا آپؐ کی اصل ڈیوٹی صرف قرآن کریم دوسروں تک پہنچانے کی تھی اور بس؟

شاید یہ سب کام، بلکہ کئی اور اہم کام آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کے مقاصد کے طور پر بیان کئے جا سکتے ہیں، کئے گئے ہیں، اور کئے جا رہے ہیں۔ لیکن اپنی افتادِ طبع اور ذاتی فیل شناسی کے کمالات دکھانے کے بجائے خود اللہ اور اُس کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی زبانی بھی اِس مقصدِ بعثت کو ڈھونڈنے اور سمجھنے کی ایک کوشش کبھی تو کر دیکھیں (ممکن ہے آپ کو یہ بھی ہماری فیل شناسی کا ہی ایک مظہر معلوم ہو) اس بندۂ ناکارہ نے اس مقصد کے لئے قرآن و حدیث کی اُن نصوص پر غور کیا جن میں آنحضورؐ کے مقصدِ نبوّت و بعثت کو لامِ کے (تاکہ) کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تو یہ باتیں سامنے آئیں:

I - ظلمات سے نور کی طرف نکالنا

(i) كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ (سورۃ ابراہیم)

(ii) هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (سورۃ الحدید)

(iii) قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۔ (سورۃ الطلاق)

(iii) قابلِ غور ہے کہ ایمان وعملِ صالح والوں کو بھی ظلمات سے نور کی طرف لے جانے کا ذکر ہے۔ (ایمان وعملِ صالح کے بعد بھی ظلمات کے سلسلے کیا ہو سکتے ہیں)

II غلبۂ دین کے لئے (i) سورۃ التوبہ، سورۃ الصف کی آیات تکرار یا اکمال و اتمام دین کے لئے (معانی اظہار)

آنحضورؐ کے منصبِ رفیع اور فضائل کے سلسلے میں بہت کچھ قرآن کریم میں ہے مگر لام کَیْ کے ساتھ مقصدِ نبوت پر روشنی ڈالنے والی آیات یہی ہیں۔ اسی طرح بُعِثْتُ (میں بھیجا گیا) سے شروع ہونے والی احادیث میں سے بعض میں آپ کے فضائل یا آپ کے منصبِ رفیع کی جھلک بھی ملتی ہے۔ مثلاً بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السمحة ـــــ بعثت بجوامع الكلم ، بعثت الى الناس كافة ، بعثت انا والساعة كهاتين وغيرها۔ مگر احادیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے لام کَیْ (تاکہ) کے ساتھ جو مقصدِ بعثت بیان ہوا ہے، وہ الفاظ کے اختلاف کے باوجود ایک ہی بیان ہوا ہے۔

(۱) بعثت لاتمم حسن الاخلاق (مشکوٰۃ بحوالہ مؤطا، مسند)

(۲) بعثت لاتمم صالح الاخلاق (الجامع الصغیر بحوالہ مستدرک)

(۳) انما بعثت لاتمم مكارم الاخلاق ومحاسن الاعمال (بطل الانبیاء بحوالہ بیہقی ومسند)

اِن آیات و احادیث کو سامنے رکھیں تو ظلمات سے نور (مراحل افکار کے بعد) رذائل کی ظلمتوں سے فضائل و مکارم کے نور کی طرف آنا بھی مراد ہو سکتا ہے، آخر ظلمات تو متعدد ہی ہیں۔ غلبۂ دین والی آیات کو لیں تو غلبہ بذریعہ تلوار (اور محض تلوار) کے علاوہ غلبہ بذریعہ فضائل و مکارم بھی مراد لیا جا سکتا ہے۔ بلکہ حقیقی غلبہ وہی ہے جو سیاسی + اخلاقی ہو ـــ (آیت التحریم سے استدلال) اگر : لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کے معنی پورا دین بتا دینا ہی لئے جائیں تو سیرتِ مطہرہ میں تمام مکارم کا جمع

کر دینا بھی اس میں شامل ہے۔ اس طرح سے ہر لحاظ سے محاسن و مکارمِ اخلاق ہی آپ کی نبوّت کا مقصدِ عظیم معلوم ہوتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم نے آپؐ کے فضائل کے ذکر میں عظمت کا لفظ صرف خلق کے ساتھ استعمال کیا ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ٥ محاسن و مکارمِ اخلاق کو اپنی بعثت کا مقصد بتانے کے علاوہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مزید مختلف طریقوں سے اِن کی طرف توجّہ دلائی ہے۔

۱۔ مثلاً کبھی آپؐ نے محاسنِ اخلاق کی فضیلت و حقیقت سمجھائی:

(۱) اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔

(۲) اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ .... علیہ النّاس۔

(۳) اِنَّ مِنْ اَحَبِّكُمْ اِلَيَّ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا۔

(۴) اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ اَحْسَنَكُمْ اَخْلَاقًا۔

(۵) حُسْنُ الْخُلُقِ خُلُقُ اللهِ الْاَعْظَمِ

۲۔ کبھی آپؐ نے محاسن و مکارم کے لئے دُعا کرنا سکھایا:

(ا) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعَافِيَةَ وَالْاَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ۔

(ii) اللّٰھم اھدنی لصالح الاعمال والاخلاق فانہ لایھدی لصالحھا ولا یصرف سیئھا الا انت۔

۳۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ ابتدائے بعثت سے ہی آپ نے توحید و ردِّ شرک کے ساتھ محاسنِ اخلاق پر زور دیا (قرآن میں بھی)۔ ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب اپنے بھائی کو حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دعویٰ نبوّت کے متعلّق تحقیق کے لئے بھیجا تو انہوں نے واپس آکر آپؐ کے متعلّق یہ الفاظ کہے: رأیتہ یامر بمکارم الاخلاق۔ قصّہ بنت حاتم الطّائی میں آپؐ نے فرمایا: فان اباھا کان یحب مکارم الاخلاق واللہ یحب مکارم الاخلاق۔

اہلِ عرب محاسنِ اخلاق سے یکسر ناواقف نہیں تھے، مگر یہ صفت ان میں کمیاب اور جُزوی اخلاق کی حیثیّت رکھتی تھی۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے محاسنِ اخلاق کو حکمِ شرع و اُصولِ اسلام اور آدابِ سُنّت قرار دیا۔ یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اہلِ عرب عقل و

دانش کی پختگی اور شرافت و اخلاق کی جامعیت کو حکمت کہتے تھے۔ اگر حکمت کے یہ معنی سامنے رکھیں تو: الکتاب والحکمۃ میں حکمہ کے معنی بھی واضح ہو جاتے ہیں اور یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ مکارمِ اخلاق کی تعبیر خالص اسلامی ہے۔ جاہلیت کی نصوص میں محاسن کا ذکر ملتا ہے مگر کہیں مکارم کا لفظ استعمال نہیں ہوا۔ (الطفی جمعہ بحوالہ شیر فارس کانفرنس ۱۹۳۵ء روما) محاسن سے مکارم کا درجہ زیادہ بلند ہے' بلکہ محاسن کے بلند تر درجے کے لیئے مکارم کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگر: اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کو سامنے رکھا جائے تو مکارمِ اخلاق کے معنی بآسانی ذہن میں آسکتے ہیں۔ محاسنِ اخلاق کی تفصیلات سے کُتُبِ حدیث مملو ہیں۔

طریق تعلیم محاسن: (ا) سوال و جواب، فقہی سوال کم (۱۳ مسائل) اخلاقی زیادہ (ii) بعض اعمال پر سرزنش (iii) جزئی روزمرّہ کے واقعات پر ہر جگہ اخلاق کی تعلیم دینا (بکری کے واقعہ تک)

محاسن اخلاق کی اِس طویل فہرست پر نظر ڈالی جائے، جو کتب حدیث میں موجود ہے تو حُسنِ خلق کے ہمارے ہاں رائج معنوں کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اوّل تو ہمارے ہاں حُسنِ خلق "خوش اخلاقی" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے (صرف میٹھی زبان، خندہ رُوئی، ملنساری وغیرہ) باقی اعمال نظر انداز۔ تجارتی و سیاسی بد دیانتی اور معاشرتی و تہذیبی بے حیائی۔ یہ زندگی کو ایک کل نہ سمجھنے بلکہ تقسیم کر لینے اور تمام افکار و اعمال و احساسات کو ایک ہی محرّک کے تابع نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

حُسنِ خُلق کا دوسرا مفہوم زیادہ تر مخصوص شرعی آداب معاشرت تک محدود سمجھا جاتا ہے، یہ بات غلط نہیں مگر اسلامی اخلاق کا یہ ایک ناقص اور ادھورا تصوّر ہے۔ (ابوابِ کتب حدیث (الآداب)

محاسن کے مقابلے پر مکارم اخلاق کی تفصیل محدود ہے:

۱۔ آیت: خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ۝

(i) ان جبرئیل نزل علی النبیؐ فقال یا محمّد انی اتیتک بمکارم الاخلاق فی الدنیا والاخرۃ خذ العفو ...... الآیہ

(ii) قال رسول اللّٰہ ادّبنی ربی فاحسن تادیبی ثم امرنی بمکارم الاخلاق

فقال خذ العفو . . . . . الآیہ

دیگر آیاتِ مکارم ہم معنی و ہم موضوع :

(i) وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

(ii) وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا ط

(iii) وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذَٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ط

حدیث کی توضیح کے مطابق مکارمِ اخلاق یہ اُمور ہیں :

عَفْوُكَ مَنْ ظَلَمَكَ ــــ إِعْطَاءُكَ مَنْ حَرَمَكَ ــــ صِلَتُكَ مَنْ قَطَعَكَ إِحْسَانُكَ مَنْ أَسَاءَ إِلَيْكَ ــــ نَصِيحَتُكَ مَنْ غَشَّكَ، حِلْمُكَ مَنْ أَغْضَبَكَ ؛

اور غور کریں تو سب کی اصل وہی عفو، امر بالمعروف اور اعراض عن الجاہلین ہی ہے۔ خذ العفو والی آیت کا مکارمِ اخلاق پر مشتمل ہونے کا دوسرا استدلال "خلق عظیم" کے بعد والی آیات میں معاندین کے اخلاق کے ذکر سے ہوتا ہے۔ یوں مکارمِ اخلاق کی انتہا اپنے نفس پر قابو پانا اور اپنے ضمیر کو نفسانیت سے پاک کرنا ہے۔ اسی بات کو حضرت سیّد الاولیاء حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے : کن مع الحق بلا خلق وکن مع الخلق بلا نفس۔ تصوّف میں اکثر حُبّ الٰہی کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہے۔ حُبِّ الٰہی مکارمِ اخلاق کا سبب بھی ہے اور مظہر بھی (قصّہ ملک بہرام)۔ اور مکارم و محاسنِ اخلاق میں یہ بھی ہے کہ خود بے عمل نہ ہو۔ آج دوسری قوموں کے مقابلے پر خود مسلمانوں کی کمزوری یہی ہے کہ وہ اِس نسخۂ بقاء و حیات کو سینے سے لگائے خود دم توڑ رہے ہیں۔ مگر دنیا کو چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ اے لبِ گورِ دنیا! یہ تیرے پاس آبِ حیات نہیں زہرِ قاتل ہے، اِدھر آؤ آبِ حیات ہم تمھیں پیش کر رہے ہیں۔ اور دوسروں کو تلقینِ اخلاق کرتے ہیں مگر خود اپنی حالت کچھ ایسی ہے :ــ

عالم فاضل بن گئے بھول گئے اخلاق
مثبت، منفی کٹ گئے کھاتہ ہے بے باق

مقامِ محمّدی

علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام

از : پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہ

علامہ اقبال مرحوم نے یہ اشعار اپنے متعلق لکھے تھے مگر اُن سے زیادہ مجھ پر صادق آتے ہیں :

چوں بنامِ مصطفیٰ خوانم درُود ⁂ از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے پابندِ غیر ⁂ سینۂ تو از بتاں مانندِ دَیر
چوں نداری از محمدؐ رنگ و بُو ⁂ از درود خود میالا نامِ اُو

مَیں اِسی لئے سیرۃ النبیؐ کے جلسوں میں تقریر کرنے سے گریز کرتا ہوں کہ میرے اندر نہ تو آپؐ کا رنگ ہے نہ آپؐ کی بُو ہے۔ لیکن مَیں نے اس جلسے میں تقریر کے لئے، اپنے آپ کو بمشکل آمادہ کیا ہے۔ محض اس لئے کہ مَیں اپنی قوم کے نوجوانوں کو اس انقلاب سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں، جو آپؐ نے برپا کیا ہے

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن ⁂ دارم از روزے کہ می آید سخن

اِس لئے مَیں خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے سمجھانے کی اور نوجوانوں کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

دُنیا کے عجائبات میں سے ایک اعجوبہ یہ بھی ہے کہ : ۱- دنیا کے تمام بڑے مذاہب اور تمام بڑے فلسفے (مدارسِ فکر) ساتویں صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی کے آخر تک پیدا ہو گئے۔ اور جب یہ تمام فلسفے، اور مذاہب 700 B. C. TO 600 A.C. پیدا ہو چکے تو ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں یعنی 610 A.C. میں ایک نبیٔ اُمّی (صلعم) نے قرآن پیش کر کے ساری دنیا کو ① ورطۂ حیرت میں ڈال دیا اور (۲) ساری دنیا کو چیلنج بھی کر دیا (۳) ساری دُنیا میں ایک حیرت انگیز اور اس کے ساتھ

ساتھ سب سے بڑا مذہبی، ذہنی اور سیاسی انقلاب بھی برپا کر دیا (۴) بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیا تو کوئی مبالغہ نہیں ہوگا۔ (۵) اور تمام بنی آدم کو دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ حُریّتہ، اخوۃ اور مساوات کے اُصولِ سہ گانہ کی نعمت سے بہرہ اندوز کر دیا (۶) اور خدا، انسان، اور کائنات کے ربطِ باہمی کو منطقی بنیادوں پہ قائم کر کے ترقیٔ دارین کا دروازہ کھول دیا۔ اور ان حقائق سہ گانہ کی بنیادوں پر ایسے تمدّن، ایسی تہذیب اور ثقافتہ کا قصرِ رفیع تعمیر کیا جس کی نظیر چشمِ انسان تو کیا چشمِ فلک نے بھی کبھی نہیں دیکھی تھی۔

(۷) خلاصۂ کلام اینکہ اُس نبیٔ اُمّی نے ۲۳ سال کی مختصر مدّت میں نئی زمین پیدا کر دی، نیا آسمان پیدا کر دیا اور انسانوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی (جن کو صحابہ کرامؓ کہتے ہیں) جو دن کو گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کرتے تھے اور رات میں اپنے آنسوؤں سے زمین کو سیراب کرتے تھے اور اپنے سجدوں سے زمین کو رشکِ افلاک بناتے تھے۔

جن کی تسبیح و تہلیل پر فرشتوں کو رشک آتا تھا اور جن کی شانِ عفّت پر حُوریں رشک کرتی تھیں اور جن کے غضِّ بصر پر حمص کی عیسائی عورتوں نے جو انہیں دیکھنے کے لئے بن سنور کر بالاخانوں میں بیٹھی ہوئی تھیں، بے اختیار یہ کہا تھا کہ: "یہ مسلمان انسان نہیں ہیں، فرشتے ہیں!" اس لئے کہ اُن کے سپہ سالار امین الاُمّۃ حضرت ابو عبیدہ ابن الجرّاح رضؓ نے ان کو ہدایت کر دی تھی کہ تمہارے دیدارِ فرحت آثار سے اپنی نفسانی خواہشات کی تسکین کے لئے یہودی اور عیسائی عورتیں سولہ سنگھار کے ساتھ نکلی ہیں، اس لئے تم اپنی نگاہیں نیچی رکھنا، کسی عورت کی طرف مت دیکھنا۔

یہ بات بھی لائقِ توجّہ اور قابلِ غور ہے کہ بعثتِ نبویؐ یا نزُولِ قرآن کے بعد سے آج تک نہ تو دنیا میں کوئی نیا مذہب پیدا ہوا ہے نہ نیا مدرسۂ فکر (SCHOOL OF PHIL.) بظاہر نئے فلسفے قدیم فلسفوں کی جدید تعبیرات ہیں۔ اگر وقت ہوتا یا مجھ میں دماغی طاقت ہوتی تو میں دو تین گھنٹے میں اس دعوے کو مبرہن کر دیتا۔ تاہم

اربابِ علم کے تفنّنِ طبع کے لئے صرف تین مثالیں دیئے دیتا ہوں۔

(۱) نیک ٹیگیرٹ نے کہا: EGO IS REAL, GOD MUST GO. مگر اُس سے دو ہزار سال پہلے سانکھ درشن اور جین دھرم نے یہی بات کہہ دی تھی۔ M.E. نے پرانی شراب کو نئی بوتل میں بھر دیا ہے۔

(۲) ہرل نے کہا: صرف مظاہر موجود ہیں مگر اُن کی پشت پہ کوئی حقیقت بھی ہے؟ اِسے نہ ہم جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔ لیکن اس سے دو ہزار سال قبل ناگارجن نے یہی بات کہہ دی تھی۔ جو بودھ دھرم کے چوتھے فلسفیانہ اسکول NIHILISM کا سب سے بڑا شارح ہے اور منطقی موشگافیوں کے لحاظ سے عصرِ حاضر میں اگر کوئی اس کا صحیح مدِمقابل ہے تو برڈلے ہے۔

(۳) ہیگل کی ABSOLUTE IDEALISM کا بڑا شہرہ ہے مگر شری ولبھ اچاریہ نے پندرھویں صدی میں اس کی بہتر تعبیر پیش کر دی تھی بس یہ تین مثالیں کافی ہیں۔

مَیں نے اس غیر معمولی بات پر بہت غور کیا ہے اور مَیں جس نتیجے پر پہنچا ہوں، جو میرا قیاس ہے، وہ یہ ہے کہ غالباً اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مشیّتِ کاملہ کی بناء پر یہ فیصلہ فرمایا ہو کہ چونکہ قرآن ابدی اور ارفع اور اعلیٰ صداقتوں کا حامل ہے اور اس میں: PROFOUNDEST PHILOSOPHY AND HIGHEST-TRUTH - پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔ اس لئے اسے اُس وقت نازل کرنا مناسب ہوگا، جب عقلِ انسانی اپنی انتہا کو پہنچ جائے، یعنی اس ذروۂ کمال پہ جس سے بالاتر مقام اس کے لئے عقلاً متصوّر نہ ہو سکے۔ جن لوگوں نے میری طرح انڈین فلاسفی - HINDUISM, GAINISM AND BUDDH-ISM - کا بامعانِ نظر کم از کم پچاس ساٹھ سال تک مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً مجھ سے متفق ہوں گے کہ ہندی فلسفہ بلاشبہ فکرِ انسانی کی معراج ہے۔ افسوس کہ مَیں اس دعوے کو مدلّل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ موضوعِ تقریر نہیں ہے، بس یوں سمجھو کہ ہندو، جین اور بودھ مفکّرین میں ہر فلسفی نے اپنے دَور میں، کوسِ اَنا ولاغیری بجایا ہے۔ صرف ایک فلسفی کا نام لیتا ہوں: وینکٹ ناتھ المعروف بہ ویدانت دیشک جو شری

رام نوج اچاریہ کے فلسفۂ واشسٹ اَدَویت کا سب سے بڑا شارح ہے ، ۱۲۶۸ءمیں پیدا ہوا تھا اور ۱۳۷۱ء میں وفات پائی (۱۳۷۱-۱۲۶۸=۱۰۳) بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوا۔ تین سال تپس اور دھیان (مجاہدات اور مراقبات) میں بسر کئے ، اور اسّی سال تک مسلسل بذریعہ تحریر و تقریر اپنے مسلک کا منڈن اور ہندوستان کے تمام مدارسِ فلسفہ کا کھنڈن کرتا رہا۔ اُس نے شنکر اچاریہ کے فلسفۂ اَدَویت (NON - DUALISM) پر ایسے ایسے شدید اعتراضات کئے ہیں کہ بڑے بڑے حامیانِ فلسفۂ شنکر کے حواس گم ہوجاتے ہیں۔

آمدم برسرِ مطلب! جس وقت قرآن نازل ہوا تمام دنیا کے فلسفے اور مذاہبِ عالم وجود میں آچکے تھے۔ اور فکرِ انسانی اپنے کمال کو پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا ساتویں صدی عیسوی میں یہ کتاب نازل ہوئی جو :

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ÷ ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود ÷ جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ ÷ آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

واضح ہو کہ جو انقلاب قرآن نے پیدا کیا وہ نہ کسی فلسفے نے ، نہ کسی مذہب نے نہ کسی CULT نے ، نہ کسی تحریک نے ، اور نہ کسی جماعت نے ، نہ کسی فرد نے بقول M . N . ROY پیغمبرِ اسلام نے صرف ایک انقلاب ہی برپا نہیں کیا بلکہ :

HE WAS THE GREATEST REVOLUTIONARY THE WORLD HAS EVER SEEN.

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے برپا کردہ انقلاب کے سامنے LENIN کا انقلاب بچّوں کا کھیل نظر آتا ہے۔ لینن نے شیاطین کی فوج پیدا کی ، جبکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے SUPERMEN کی جماعت تیار کردی۔ جنھوں نے دنیا کو عدل اور امن سے معمور کردیا :

VIDE "THE HISTORICAL ROLE OF ISLAM."

لینن نے صرف معاشی انقلاب برپا کیا۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے ہمہ گیر انقلاب برپا کیا ، لینن نے غور و فکر کا دروازہ بند کردیا جب کہ :

THE BIRTH OF ISLAM IS IN THE EYES OF A PHIL. THE BIRTH OF INDUCTIVE INTELLECT IN THE WORLD. (نوٹ: رائے نے یہ بات متکلمینِ اسلام سے سیکھی تھی)

اب سوال یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا میں مختلف النوع مذاہب بھی تھے اور فلسفے بھی اور اخلاقی ضوابط (ETHICAL CODES) بھی تو اسلام یا قرآن کی کیا ضرورت تھی؟ پیغمبرؐ نے کس کمی کو پورا کیا؟ بالفاظِ دگر، قرآن کی کیا ضرورت تھی؟ یا آپؐ کا کارنامہ کیا ہے؟ — اس کا جواب یہ ہے کہ ظہورِ اسلام یا بعثتِ نبویؐ کے وقت (ساتویں صدی عیسوی میں) دنیا میں سب کچھ تھا مگر توحیدِ باری تعالیٰ نہیں تھی۔ قرآن نے یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کمی کو پورا کیا اور دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے مکمل CODE عطا کر دیا جو انسان کی زندگی کے ہر شعبے پر حکمران ہے اور ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے۔ اقبالؔ نے ان اشعار میں اسی حقیقت کو واضح کیا ہے:

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست
(انسان پرستی)

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش
(ملوکیت)

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
(احبارؔیت)

صاحبِ اورنگ و ہم پیر کنشت
باج برکشتِ خرابِ او نوشت
(کلیسائیت)

در کلیسا اسقفِ رضواں فروش
بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
(برہمنیت اور مجوسیت)

برہمن گل از خیابانش بہ بُرد
خرمنش مُغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نَے اُو خوں شدہ

تا امینِ حق بحقداراں سپرد ٭ بندگاں را مسندِ خاقاں سپرد
زادنِ اُو مرگِ دُنیائے کہن مرگِ آتش خانہ و دیر و شمن

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے جو انقلاب برپا کیا اس کی ایک جھلک ہم ان اشعار کے ذریعے سے دیکھ سکتے ہیں :

در شبستانِ حرا خلوت گزید ٭ قوم و آئین و حکومت آفرید
در جہاں آئینِ نَو آغاز کرد ٭ مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد ہمچو اُو بطنِ اُمِّ گیتی نہ زاد

اب مَیں اپنے دعوے کو تاریخِ مذہب کی روشنی میں مبرہن کرتا ہوں،
ظہورِ اسلام کے وقت دُنیا میں حسبِ ذیل مذاہب موجود تھے :

(۱) شنٹو جاپان کا قومی یا قدیمی INDIGENOUS مذہب ہے اس کا مطلب ہے: "قومی دیوتاؤں کا راستہ!" ان دیوتاؤں کی سرتاج سورج کی دیوی ہے
نوٹ : سورج کی پوجا 600 B.C. میں جاپان سے لے کر یونان تک ہوتی تھی۔ سورج کو خدا کا بیٹا (SON OF GOD) کہتے تھے، از ہندوستان تا یونان۔ اِس کے علاوہ ہر ملک میں مقامی خدا کے بیٹے معبود بنے ہوئے تھے چونکہ بادشاہ سورج کی دیوی کی اولاد ہے، اس لئے اب شنٹو ازم کا مطلب ہے شاہ پرستی، چنانچہ ولی عہد کو "آفتاب کا مبارک فرزند" کہتے ہیں۔ آج کل شنٹو مجموعہ ہے : (شاہ + فطرت + اسلاف پرستی) کا۔ توحیدِ الٰہی کا دُور دُور تک نشان نہیں

(۲) TAO ISM کا بانی لاؤزی LAO-TSE تھا جو کنفوشس کا ہم عصر تھا (تاریخ ولادت 604 B.C.) اس کی تصنیف کا نام "تاؤ تے گنگ" ہے جو اس مذہب کی مقدّس الہامی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ TAO طاؤ کا لفظی معنی ہے راستہ یا طریق۔ THE ABSOLUTE IN ITSELF IS UNKNOWABLE.

آگے چل کر شرک اور بُت پرستی، خانقاہیں۔ توحید غائب ہو گئی اور دیوی دیوتاؤں کی پوجا شروع ہو گئی۔ تم کائنات کو اپنی مرضی سے ہم آہنگ نہیں کر سکتے، اس لئے تم خود حالات سے ہم آہنگی پیدا کر لو۔

(۳) کنفوشس (551 - 473 B.C.) اس نے اخلاقی اور سیاسی نظام پیش کیا — اِن تینوں مذاہب میں توحیدِ ایزدی کی تعلیم نہیں ہے شخصیت پرستی اور بُت پرستی عام ہے۔

(۴) ہندو دھرم میں شرک بھی ہے، توحید بھی ہے لیکن بت پرستی عام ہے — ساتویں صدی عیسوی میں عام ہو چکی تھی۔ (توحید افراد میں تھی، قوم مشرک تھی)

(۵) جین دھرم اور (۶) بودھ دھرم میں خدا کا انکار ہے۔ (۷) ZOR میں یزداں اور اہرمن یعنی توحید کے بجائے ثنویت DUALISM ہے۔

(۸) مانی کا مذہب مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ اس کی بنیادی تعلیم توحید نہیں ہے بلکہ MATTER IS EVIL۔ لہٰذا مقصودِ حیات ترکِ دُنیا ہے۔

(۹) GNOSDICISM (مسلکِ عرفان) نصرانیت کے ابتدائی زمانے میں عیسائیوں میں ایک فرقہ پیدا ہوا تھا۔ چونکہ توحید کا حامی تھا اس لئے تثلیث نے اسے ختم کر دیا۔ (۱۰) مزدکیت میں خُدا کا کوئی تصوّر نہیں تھا، صرف معاشی نظام تھا۔ مزدک پہلا اشتراکی تھا۔ زن، زر اور زمین تینوں مشترک۔

(۱۱) مقراازم : عیسائیت کا سب بڑا رقیب تھا۔ "مقرا" خدا کا اکلوتا بیٹا تھا، مصلوب ہوا، اب آسمان پر ہے۔

(۱۲) صابی۔ عراق کے ستارہ پرست تھے۔ اور انہوں نے احبار کو اربابًا مّن دُونِ اللہ بنا لیا۔

(۱۳) یہودیت میں توحید تھی مگر رفتہ رفتہ عُزیر ابن اللہ بن گیا۔

(۱۴) عیسائیت میں بھی توحید تھی مگر ظہورِ اسلام کے وقت ساتویں صدی عیسوی میں توحید کی جگہ تثلیث دماغوں پر حکمران تھی اور مسیح ابن اللہ تھا۔ جب خالدِ جانباز رضی اللہ تعالیٰ عنہ دمشق کے دروازے پر دستک دے رہے تھے، تو عیسائی یہ بحث کر رہے تھے کہ ولادتِ یسوع کے بعد مریم VIRGIN رہیں یا نہیں؟ یسوع انسان تھے یا خدا یا دونوں؟ متعدد فرقے اُسی طرح لڑ رہے تھے، جس طرح چنگیز اور ہلاکو کے زمانے میں احناف اور شوافع، معتزلہ اور اشاعرہ، سُنّی اور شیعہ آپس میں لڑ رہے تھے۔

(۱۵) مجوسیت: یہ زرتشتی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل تھی - خدا پرستی کے بجائے آتش پرستی اور رسوم پرستی، یہ حالات تھے جب ۶۱۰ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکے میں توحید ایزدی کا علم بلند کیا - یہ دنیائے مذہب کا سب سے بڑا انقلاب تھا

MOHD. IS CERTAINLY THE GREATEST REVOL-UTIONARY THE WORLD HAS EVER SEEN AS WELL AS THE MOST SUCCESSFUL OF ALL THE REL. PERSONALITIES OF THE WORLD.

چونکہ قرآن کے ساتھ دین کامل ہوگیا اور نعمت تمام ہوگئی اس لئے مشیت نے دین کی روح یعنی توحید باری کو اس طرح کامل کردیا کہ اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، اور شرک کے تمام راستوں کو اس طرح مسدود کردیا کہ اب کوئی شخص انتہائی کوشش کے باوجود کوئی چور دروازہ نہیں کھول سکتا - اور میرے طویل مطالعے اور غور و فکر کی رُو سے قرآن یا اسلام کا کمال بس اسی میں مخفی یا مضمر ہے :

NO BODY CAN IMPROVE UPON THE DOCTRI-NE OF THE UNITY OF GOD AS PROPOUNDED BY THE UNLETTERED P. OF THE DESERT.

ورنہ اخلاقی تعلیم تو سب مذاہب میں موجود تھی۔ قرآن کو اس باب میں کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے، ہاں اُسے یہ فخر ضرور حاصل ہے کہ اُس نے شرک کی تمام ممکن صورتوں کو مٹادیا اور چونکہ صرف مردِ حُر، توحید کے اقتضاء پر عمل کرسکتا ہے اس لئے قرآن و حدیث نے غلامی کی تمام صورتوں کو بھی مٹادیا ہے

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کیلئے　　نے کوئی فغفور و خاقاں نے گدائے رہ نشیں

کانٹ کہتا ہے کہ جب تک انسان کو حریتِ کاملہ حاصل نہ ہو وہ اخلاقی زندگی بسر نہیں کرسکتا - کاش! کوئی مسلمان کانٹ کو بتاتا کہ یہ نعمت صرف آپؐ نے انسان کو دی - مگر سلاطینِ عثمانی، ترکانِ تیموری کی طرح خود اسلام سے بیگانہ تھے، بتاتا کون؟ سلیمان نے یورپ کو نہیں بتایا - اورنگ زیب نے ہندوستان کو نہیں بتایا - انسان کی بنیادی کمزوری شرک ہے، اس لئے قرآن یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

شرک کی تمام صورتوں، یعنی شرک فی الوجود، شرک فی الذّات، شرک فی الصّفات شرک فی الحکم، شرک فی العبادت، شرک فی التّصرف، شرک فی التّاثیر اور شرک فی الآثار کو مٹا دیا۔

جب انسان کو حُرّیّتِ کاملہ حاصل نہ ہو وہ اللہ کی عبادت نہیں کر سکتا اس لیے آپؐ نے غلامی کی تمام صورتوں، یعنی جسمانی غلامی، ذہنی غلامی، ضمیر کی غلامی، نفسِ ناطقہ کی غلامی، علم (حاصل کرنے) کی غلامی، پیشے کی غلامی، رنگ، نسل اور ذات پات کی غلامی، سیاسی غلامی اور معاشی غلامی کو مٹا دیا۔ چونکہ بانیانِ مذاہب کو خدا بنایا گیا تھا، اس لیے آپؐ کو حکم ہوا: "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ"!

جس دین نے ساری دُنیا کو ہر قسم کی غلامی سے رہائی بخشی تھی، ۱۹۷۸ء میں اس دینِ متین کے پیرو بفضلِ خدا و رسولؐ، ہر قسم کی غلامی مبتلا ہیں۔ اور مزید کرم یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے تا ایں دم غلامی کی ہر نوع میں روز بروز شدّت و غلظت ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے شیخ ہجویرؒ کے مزار کے قرب و جوار میں ایک باورچی کی دکان بھی نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج پچاس سے زائد باورچی باسمتی کی بریانی ۴۰، ۵۰ پکّی پکائی دیگیں تیار لیے بیٹھے مومنین و موحدینِ قانتین کے لئے چشم براہ ہیں۔ اور شام تک سب بک جاتی ہیں۔ یہ داتا حضورؒ کے فیض کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ جو آتا ہے نہ خالی ہاتھ واپس جاتا ہے، نہ خالی پیٹ۔ اور اگر آپ ماہرِ فن ہیں تو سلام کرنے والیوں کے طلائی زیورات بھی آپ کے ہاتھ کی صفائی کے منتظر ہیں۔

مَیں نے بدقسمتی سے تاریخِ اسلام بھی پڑھی ہے، کسی صحابی یا تابعی یا تبع تابعی نے آپؐ کے مزارِ مبارک کو گلاب اور کیوڑہ بہ معنی، سادے پانی سے بھی غسل نہیں دیا۔ لیکن داتا کے مزار کو ہر سال منوں گلاب اور کیوڑے کے عرق سے غسل دیا جاتا ہے اور وہ غسالہ عوام تو کالانعام ہیں، خواص کے لئے بھی گوگردِ احمر اور طوطیائے چشم بن جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام اینکہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تو قبور کو پختہ کرنے سے بھی منع فرمایا تھا۔ مگر آپؐ کے عاشقوں نے آپؐ کے متبعین کے مزاروں پر ایسے ایسے فلک بوس

گنبد تعمیر کئے ہیں جو میلوں دُور سے زائرینِ باتمکین کو دعوتِ رکوع وسجود دے رہے ہیں۔ اور ہم نے تو ایک مزارِ پُرانوار، سعادت آثار کی تعمیر پر بیس کروڑ روپے سے زیادہ صرف کئے ہیں۔ حالانکہ ہماری قومی اور معاشی حالت اس قدر زار و زبوں ہے کہ ہم کروڑوں روپے سالانہ صرف بطورِ سود ادا کر رہے ہیں، اُس رقم پر جو ہم نے بطورِ قرضۂ غیر حسنہ لے رکھی ہے۔ اپنے بچپن میں "اُونٹ رے اُونٹ تیری کون سی کل سیدھی!" کی ضرب المثل سُنی تھی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ۱۹۷۸ء میں یہ مثل خود ہم پر صادق آجائے گی۔ وہ آخر سے "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز!"۔ ورنہ در محفلِ رنداں رازے نیست کہ نیست

خلاصۂ کلام اینکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم توحید کے سب سے بڑے علمبردار ہیں لیکن آپ کے عُشّاق اس وقت شرک کے سب سے بڑے حامی اور مشرکوں کے سب سے بڑے سردار ہیں۔ اصلاحِ احوال کی صرف ایک ہی صورت ہے ؎

گر تومی خواہی مُسلماں زیستن ٭ نیست ممکن جُز بقرآں زیستن

: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ط یعنی مسلمانوں کو تدبّر فی القرآن کی دعوت دینا۔ میرا عقیدہ ہے کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھ لینے کے بعد کوئی شخص شرک کی کسی صورت کا بھی ارتکاب نہیں کر سکتا۔ پس قرآن خود بھی پڑھو اور دوسروں کو بھی پڑھاؤ! ؎

من آنچہ شرطِ بلاغ ست باتو می گویم ٭ تو خواہ از سُخنم پند گیر خواہ ملال!

آپؐ کی خصُوصیات

۱۔ صرف آپؐ کی شخصیّت تاریخی طور ثابت ہے۔ اگر مَیں مناظرانہ رنگ میں یہود یا نصاریٰ یا ہنُود یا مجوس سے کہوں کہ حضرت موسٰیؑ، حضرت عیسٰیؑ اور حضرت رام یا کرشن یا زرتشت کی شخصیّت تاریخی طور ثابت کرو تو چاروں دم بخود ہو جائیں گے۔

۲۔ دوسری خصوصیّت : آپؐ نے اپنی وفات سے قبل اپنا پیغام کتابی صورت میں مکمّل اُمّت کو دے دیا جس کی GENUINENESS AUTHENTITY AND INTEGRITY AND PURITY کا اعتراف اپنے تو اپنے دشمنوں کو بھی ہے۔ ولیم میور نے ۱۸۶۱ء میں لکھا تھا : "THERE IS NO BOOK

UNDER THE SUN WHICH FOR THE LAST 12 CEN.
HAS REMAINED WITH SO PURE A TEXT."

۳- آپؐ کی زندگی اگرچہ محدثین کی کوششوں سے محفوظ ہے، لیکن آپ کی
تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ساری حدیث کی کتابیں تلف ہو جائیں تو صرف قرآن سے آپؐ
کی لائف مرتب ہو سکتی ہے۔ : CF گیتا سے سری کرشن کی لائف مرتب نہیں ہو سکتی
توریت سے موسیٰ علیہ السّلام کی، زبور سے داؤد علیہ السّلام کی اور انجیل سے عیسیٰ علیہ
السّلام کی، دھمپد سے گوتم بدھ کی، انگ سے مہاویر کی لائف مرتب نہیں ہو سکتی۔
۴- آپؐ واحد پیغمبر یا مصلح ہیں، جس نے جو تعلیم دی اس پہ خود بھی عمل کر کے دکھایا
اور دوسروں سے بھی عمل کرا دیا۔
۵- آپؐ واحد پیغمبر یا مصلح ہیں جس نے اضداد کو جمع کر دیا یعنی:
آپؐ نے REALISM اور IDEALISM کو جمع کر دیا
COLLECTIVISM اور INDIVIDUALISM کو جمع
COMMUNISM اور CAPITALISM کو جمع کر دیا
MATTER اور SPIRIT 〃 〃 〃
دُنیا اور دین 〃 〃 〃
LAITY اور CLERGY 〃 〃 〃
HEREAFTER اور HERE 〃 〃 〃

۶- آپؐ کی پوری زندگی محفوظ ہے
۷- آپؐ نے بیک وقت تین نعمار دُنیا کو دیں، یہ فخر کسی مصلح کو حاصل نہیں
ہے۔ آپؐ نے ایک قوم بنائی، اُسے مکمل آئینِ حیات دیا اور مکمل اخلاقی نظام
اور اخلاقی نصب العین اور HIGHEST ETHICAL IDEAL:
پھر بالفعل حکمران بنا دیا۔ تاکہ دُنیا قول اور عمل میں مطابقت کا نظارہ دیکھ سکے۔
۸- اللہ ربّ العالمین ہے، آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔
۹- اللہ کائنات پر رؤف اور رحیم ہے۔ آپؐ مومنون پر !
۱۰- آپؐ پر نبوّت ختم ہو گئی، کمالاتِ نبوّت ختم ہو گئے۔ آپؐ کی ختمیت

بقول حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ذاتی ہے، اور آپؐ کی اُمت خیر الامم ہے (کنتم خیر اُمۃ)

۱۱- آپؐ کی گیارھویں خوبی یا خصوصیت تعلیم یہ ہے کہ انسانی شخصیت کے تینوں پہلوؤں: علم و جذبہ و ارادہ کی یکساں تربیت۔ HARMONIOUS DEVELOPMENT کا دستور العمل عطا کر دیا۔

۱۲- جہاد فی سبیل اللہ کو رہبانیتِ اسلام قرار دیا یعنی اسلام میں ترکِ دنیا ہے مگر وہ غار و کوہ میں خلوت نشینی کا نام نہیں ہے بلکہ میدانِ جہاد میں اللہ تعالیٰ کیلئے ترکِ دُنیا کر دینا۔

۱۳- آپؐ نے ایک لاکھ سے زائد انسانوں کو شرک اور بُت پرستی، شخصیت پرستی اور اوہام پرستی سے پاک کر دیا، اور اُن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور دینِ اسلام کی محبت کا رنگ پیدا کر دیا۔

<u>ہمارا فرض (حرفِ آخر)</u> | ہمارا فرض اس وقت یہ ہے کہ ہم رُوحانیت اور مادیت میں امتزاج کے طریقِ کار (پروگرام) کو، جو آپؐ نے ہمیں مذہب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ عطا کیا، دُنیا میں عام کر دیں۔ اس کے دو فائدے ہوں گے:

۱- ہم موردِ فضلِ الٰہی بن جائیں گے۔

۲- یورپ کو اس وقت اسی نسخے کی ضرورت ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ یورپ اسلام کے مطالعے کی طرف مائل ہو جائے گا۔ (cf لارڈ لوتھین کا مشورہ ۱۹۳۸ء)

<u>استدراک</u> | میں نے ۱۹۳۴ء میں ایک مضمون لکھا تھا:

قرآن مجید نے ہستیٔ باری تعالیٰ پر بھی دلائل دیئے ہیں، اور توحید (ذات) باری تعالیٰ پر بھی۔

(الف) ہستی پر بہترین دلیل: اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ ○

(ب) شرک فی الوجود کا ابطال: هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔

(ج) توحید پر دلیل: لَوْ كَانَ فِيْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔

(د) کثرتِ ایں نقش ہا عرضِ تجلی ہائے اوست
در دو عالم غیر یک نقاش کس موجود نیست

سیّدنا بلالؓ

محمد یونس جنجوعہ ایم اے، ایم ایڈ۔ جنڈیالہ شیر خاں شیخوپورہ

حضرت بلالؓ بن رباح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابیؓ ہیں۔ غلاموں میں آپ سب سے پہلے ایمان لائے۔ چونکہ آنحضرت کی تبلیغ پر لبیک کہنا اُس وقت آسان بات نہ تھی، اِس لئے آغازِ اسلام میں جس قدر تکالیف حضرت بلالؓ نے برداشت کیں، کسی دوسرے نے نہ کیں۔ وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام پر دل وجان سے فدا تھے۔ اُن کا آقا اُن کو بُری طرح پیٹتا، لہولہان کر دیتا، لڑکوں کے سپرد کر دیتا جو اُنہیں گلی کوچوں میں گھسیٹتے پھرتے، تپتی ریت پر لٹا دیتا۔ غرض جتنی تکلیف ممکن ہو سکتی، پہنچاتا۔ مگر حضرت بلالؓ بڑی جواں مردی کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتے اور حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہ لاتے۔ ایک دفعہ وہ اَحَدٌ اَحَدٌ پکار رہے تھے اور کفار انہیں پیٹ رہے تھے کہ اُدھر سے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گزر ہوا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ زور زور سے نہ کہو، دل ہی دل میں اللہ کا نام لے لو۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے، مگر پھر صدیقِ اکبرؓ کا گزر ہوا تو بلالؓ اَحَدٌ اَحَدٌ پکار رہے تھے۔ آپؓ نے پوچھا خاموشی سے ذکر کیوں نہیں کرتے۔ بلال رضی اللہ تعالےٰ عنہ کہنے لگے کہ خاموشی سے ذکر کر کے دیکھا ہے، لذّت نہیں آتی۔ پکار کر ذکر کرتا ہوں تو اس قدر لطف آتا ہے کہ بیخودی کی کیفیت میں کفار کی مار پیٹ کا بھی احساس نہیں رہتا۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آبائی وطن حبشہ تھا، اِس لئے وہ بلالِ حبشیؓ کے نام سے مشہور ہیں۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ (دین کے معاملہ میں) سبقت لے جانے والے چار ہیں۔ مَیں عرب میں سے سبقت کرنے والا ہوں، صہیبؓ رُوم سے سلمانؓ فارس سے اور بلالؓ حبشہ سے۔

حضرت بلالؓ عرب میں اجنبی تھے۔ جب ان کو مار پڑتی تو کوئی ان کی سفارش کرنے والا نہ ہوتا، اور نہ ہی کفّار کو اُن کے خویش و اقارب کی طرف سے کوئی خوف ہوتا۔ چنانچہ امیّہ بن خلف نامراد خوب جی بھر کر انہیں ستاتا۔ ایک دن اُمیّہ بن خلف اور اس کے ساتھی

حضرت بلال رضؓ کو مار پیٹ رہے تھے کہ اس طرف سے حضرت ابو بکر رضؓ صدّیق کا گزر ہوا۔ آپ رضؓ نے امیّہ بن خلف کو ملامت کی۔ اُس نے کہا تو نے ہی اسے بگاڑا ہے، اب تو ہی اسے چھڑا لے۔ حضرت صدّیق رضؓ نے کہا، ہاں میں چھڑا لوں گا۔ میرے پاس ایک سیاہ فام غلام ہے جو بلال رضؓ سے زیادہ طاقتور اور تیرے دین پر پختہ ہے، اُسے ان کے بدلے میں دے دوں گا۔ امیّہ بن خلف نے منظور کر لیا۔ پس صدّیقِ اکبر رضؓ نے اپنے غلام کے بدلے حضرت بلال رضؓ کو خرید کر آزاد کر دیا، اور اس طرح صدّیقِ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بدولت اس عاشقِ رسول رضؓ کو مستقل عقوبت سے نجات ملی۔ چونکہ وہ اسلام کی خاطر تکالیف برداشت کرنے میں منفرد تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی انہیں منفرد مقام حاصل ہوا۔ حضرت جابر رضؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں جنّت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے آگے ایک آہٹ سُنی۔ میں نے جبریل علیہ السّلام سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ بلال رضؓ ہیں۔ جب بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ کو یاد کرتے تو خوشی سے اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔

جب مشرکینِ مکّہ نے مسلمانوں کا رہنا مشکل کر دیا تو رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صحابہ کرام رضؓ کو مدینہ ہجرت کر جانے کی اجازت دی۔ چنانچہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ چند دوسرے صحابہ رضؓ کے ساتھ شروع میں ہی مدینہ منوّرہ پہنچ گئے۔ بعد ازاں رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم بھی صدّیقِ اکبر رضؓ کی معیّت میں وہاں آگئے۔ جب آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے انصار اور مہاجرین میں مواخات قائم فرمائی تو حضرت بلال رضؓ مہاجر کو عبیدہ بن الحارث انصاری کا بھائی بنایا۔

قریشِ مکّہ نے مدینہ منوّرہ میں بھی مسلمانوں کو چین نہ لینے دیا۔ چنانچہ ہجرت کے اگلے سال جنگِ بدر کا معرکہ ہوا۔ دیگر جاں نثار صحابہ کرام رضؓ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس جنگ میں حصّہ لیا اور خوب دادِ شجاعت دی۔ یہاں تک کہ بدبخت اُمیّہ بن خلف کو قتل کیا۔ خدا کی شان دیکھئے، ایک دن وہ تھا کہ بلال رضؓ بے یار و مددگار اُمیّہ کے ہاتھوں پٹتا تھا۔ لیکن آج اسی بلال رضؓ کی تلوار سے اُمیّہ قتل ہو رہا ہے۔ ہر دَور کے شوریدہ سر، سرکش، ظالم اور متکبّر لوگوں کے لئے اُمیّہ کا قتل عبرتناک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲ھ میں نماز باجماعت کا اعلان کرنے کے لئے اذان مقرر ہوئی تو رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اذان دینے پر مامور کر دیا۔ اس طرح حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو پکار پکار کر "اَحَدٌ" کہنے کا شوق تھا، کی تمنا پوری ہوئی اور وہ سیّد المؤذّنین اور مؤذّنِ رسولؐ بنے۔ یہ وہ اعزاز تھا کہ جس کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے: "مَیں پچھتاتا ہوں کہ کاش رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کہہ کر حسنؓ و حسینؓ کو مؤذّن کرا دیتا!"

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفر اور حضر میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ رہتے تھے۔ اور نماز کا وقت آنے پر اذان دیتے تھے۔ یہاں تک کہ سفر میں جہاں بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان دیتے وہاں کے لوگوں کو رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے آنے کی اطّلاع مل جاتی۔ حضورؐ کے ارشاد پر اذان کے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنی شہادت کی انگلیاں کانوں میں دے لیا کرتے تاکہ آواز زیادہ بلند ہو۔

اذان کے علاوہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے حکم سے بعض اعلان بھی کیا کرتے تھے۔ جہاد میں جانے کے لئے، مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کے لئے وغیرہ۔ جنگِ حنین میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ کھڑے ہو کر اعلان کر دیں: "جنّت میں مومن کے سوا کوئی داخل نہ ہوگا اور بلاشبہ اِس دین کی تائید اللہ تعالیٰ بدکار آدمی کے ذریعہ بھی کریں گے!"

یہ جو مشہور ہے کہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اذان میں ش کی بجائے س بولتے تھے بالکل غلط ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خزانچی بھی تھے۔ اگر کوئی ضرورت مند آکر سوال کرتا تو آپؐ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیتے کہ اس کی ضرورت پوری کریں۔ چنانچہ وہ حکم کی تعمیل کرتے، خواہ قرض ہی لینا پڑے۔ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ کھجوریں اکٹھی کر لیں تاکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مہمانوں کے کام آئیں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کو معلوم ہوا تو فرمایا "اے بلال! خرچ کئے جاؤ اور عرش والے کی طرف سے کم ہو جانے کا خوف مت کرو!" مال کے جمع کرنے سے آپؐ سخت پرہیز کرتے تھے۔ چنانچہ وقتاً فوقتاً اس ضمن میں حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہدایات دیتے رہتے۔ ایک دفعہ کچھ مال مسجدِ نبوی میں جمع ہو گیا اور سارا دن تقسیم کرنے کے باوجود بچ رہا۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو معلوم ہوا تو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وجہ پوچھی انہوں نے کہا کہ کوئی اور سائل نہ آیا اور مال پڑا رہا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ میں مال کی موجودگی میں گھر نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ رات مسجد میں بسر کی۔ اگلے دن جب بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ تمام مال تقسیم ہو چکا تو پھر آپؐ گھر تشریف لے گئے۔ ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا "اے بلالؓ! تنگ دست ہو کر مرنا اور مالدار ہو کر مت مرنا!"

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلّم سے حد درجہ محبت تھی۔ اس لئے آپؐ کی ہر ادا ان کو بھاتی تھی۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کئی کئی دن تک بھوک اور پیاس برداشت کرتے۔ چنانچہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی فاقے سے رہتے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ مجھ پر تیس دن، رات ایسے گزرے ہیں کہ میرے اور بلالؓ کے کھانے کے لئے جاندار کی خوراک میں سے صرف اتنی چیز تھی، جو بلالؓ کی بغل میں چھپی ہوئی تھی۔

ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہِ نبوّت میں صبح کے وقت حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کھانا کھا رہے تھے۔ آپؐ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کھانے میں شریک ہونے کو کہا۔ انہوں نے جواب دیا، اللہ کے رسول! میرا روزہ ہے۔ یہ سُن کر حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "ہم اپنا رزق کھا رہے ہیں اور بلالؓ کا رزق جنّت میں محفوظ ہے!" پھر آپؐ نے بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا، بلالؓ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ روزہ دار کی ہڈیاں تسبیح میں مشغول رہتی ہیں۔ اور اس کے لئے فرشتے استغفار کرتے ہیں، جب تک اُس کے پاس کھایا جاتا رہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سفر اور حضر میں رسول پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ آپؐ کے ہر قول و فعل کو غور سے دیکھتے تھے اور اُس کی پیروی کرتے تھے۔ تمام غزوات میں وہ آپ کے ساتھ رہے۔ بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس امتیاز پر رشک کرتے تھے۔ ایک دفعہ عید کی نماز کے موقع پر آپؐ خطبہ ارشاد کرنے کھڑے ہوئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ اور ان کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بارگاہِ رسالت میں کس قدر قرب حاصل تھا۔

ایک دفعہ حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ اعلیٰ قسم کی کھجوریں لے کر آپؐ کے پاس حاضر ہوئے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا، یہ کہاں سے آئی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ میرے پاس خراب کھجوریں تھیں، میں نے اُن کے دو صاع کے بدلے میں یہ اچھی کھجوریں ایک صاع لے لی ہیں۔ یہ سُنتے ہی آپؐ نے فرمایا، اُف! یہ تو سراسر سُود ہے۔ ایسا نہ کیا کرو۔ اِس کی صورت یہ ہے کہ خراب کھجوروں کو کسی اور دوسری چیز کے بدلے بیچ دو پھر جو چیز تم نے اپنی کھجوروں کی قیمت میں لی ہے اُس کو قیمت میں دے کر وہ اچھی کھجوریں خرید لو۔

رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی تو بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے مدینہ میں رہنا محال ہوگیا۔ انہوں نے عمر کا باقی حصّہ جہادِ فی سبیل اللہ میں بسر کرنے کا ارادہ کرلیا، اور ملکِ شام چلے گئے۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے زمانہ خلافت میں ملکِ شام گئے تو حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی۔ امیرالمؤمنینؓ کی فرمائش پر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اذان پڑھی۔ کہتے ہیں کہ اُس دن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمانۂ نبوی کو یاد کرکے بہت روئے۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ملکِ شام میں شادی کرلی، مگر آپؓ کی اولاد کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ حضرت بلالؓ کو ملکِ شام میں سکونت اختیار کئے کافی عرصہ گزر گیا، تو ایک بار انہیں خواب میں رسولِ پاکؐ کی زیارت ہوئی اور انہوں نے فرمایا بلالؓ یہ کیا بے وفائی ہے، کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ہمارے پاس آؤ۔ خواب سے بیدار ہوئے تو مدینہ کی طرف چل پڑے۔ قبرِ مبارک پر حاضر ہوئے اور جذبات پر قابو نہ پاسکے۔ اتنے میں سبطینِ رسولؐ (حسنؓ اور حسینؓ) وہاں آگئے۔ ان کو دیکھ کر ان کے ساتھ پیار و محبت کیا۔ بعد ازاں انہوں نے اذان کی فرمائش کی۔ جب انہوں نے فجر کے وقت اذان دی تو مدینہ میں کہرام مچ گیا۔ لوگوں نے بلالؓ کی اذان سُنی تو انہیں عہدِ نبویؐ یاد آگیا۔ اور وہ اس قدر روئے کہ پہلے کبھی اتنا نہ روئے تھے۔ اسلام کا سچا فرزند اور رسولِ پاکؐ کا عاشقِ صادق دمشق میں ۲۰ھ میں فوت ہوگیا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۶۳ سال تھی۔ حضرت بلالؓ رسولِ پاکؐ کے مؤذّن اور خازن تھے۔ وہ آپؐ کے سفر اور حضر کے ساتھی اور جنگ و امن میں رفیق تھے۔ انہوں نے اسلام کی خاطر سخت سے سخت تکالیف برداشت کیں۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت بلالؓ کو سیّدنا کہہ کر پکارتے تھے! (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

ازواجِ مُطہّراتؓ (۲)

از: حکیم فیض عالم صدّیقی

اب اپنی قوت متخیلہ کو ذرا آگے لیجائیے اور نبی علیہ السلام کی ازواج مطہرات کا مقام سامنے لانیکے لئے النبی اولی با لمؤمنین کے ساتھ وازواجہ امہاتہم پر غور کیجئے۔ تو یطھرکم تطھیرًا کی تفسیر کا مفہوم سامنے آئیگا انہیں کامل طہارت و پاکیزگی کے بعد مومنوں کے امورات میں متصرف نبی کی بیویاں بناکر امہاتہم کا مقام بخش کر مومنوں کے جانی و مالی امورات پر متصرف ہونے کا شرف بخشا ذرا غور کیجئے زمرہ مومنین میں صحابہ کرام بدرجہ اولی شامل ہیں۔ آگے چلئے تابعین اور تبع تابعین ہیں اور آگے چلئے امت کے محدثین، مفسرین اولیائے کرام اور اس سلسلہ کو قیامت تک ذہن میں حاضر کیجئے پھر وازواجہ امہتہم کو سامنے لائیے یہ ہے مقام نبی علیہ السلام کی ازواج مطہرات کا "یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا" اور جب انہیں یہ مقام مل گیا تو حضرت صادق و مصدوق کو ارشاد ہوتا ہے۔ لَا یَحِلُّ لَکَ النِّسَاءُ مِنۡ بَعۡدُ وَلَاۤ اَنۡ تَبَدَّلَ بِہِنَّ مِنۡ اَزۡوَاجٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَکَ حُسۡنُہُنَّ ۔ اے نبی آپ کے لئے اب اور عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ اور نہ یہ کہ ان کو چھوڑ کر اور بیویاں کر لو خواہ ان کا حسن آپ کو اچھا ہی لگے۔ پاکیزہ ہو کر مومنین کی مائیں ہونے کا شرف حاصل ہو گیا۔ اب اس بھری دنیا کے اندر ان کی مثال ہی موجود نہیں یہ گویا اس کی آخری مہر ہو گئی۔ کہ ان کے بعد اے نبی آپ کو مزید کسی عورت سے نکاح کرنے کی اجازت نہیں —— مگر کیوں ہے اس لئے کہ اس مقام پر فائز ہونیکی کسی اور عورت میں اہلیت ہی نہ نکلی آگے ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ یُؤۡذُوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ لَعَنَہُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَہُمۡ عَذَابًا مُّہِیۡنًا۔ نبی علیہ السلام کے اس ارشاد سے کون ناواقف ہے کہ تم مجھے عائشہ کے معاملہ

ہیں لہٰذا دو ماقبل اور مابعد کی آیات کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم یوں سامنے آتا ہے کہ امہات المومنین کے گستاخ اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو ایذا پہنچانے والے ہیں اور وہ دنیا و آخرت میں لعنت کے مستحق اور آخرت میں ذلیل ترعذاب کے سزاوار ہیں اس سے بعد کی چوتھی آیت میں بات واضح ہو کر سامنے آگئی۔ لئن لم ینتہ المنفقون والذین فی قلوبھم مرض والمرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک الا قلیلا۔ اگر وہ منافق لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور جو مدینے میں بڑی بڑی خبریں اڑایا کرتے ہیں باز نہ آئیں گے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہ تمہارے پڑوس میں نہ رہ سکیں گے مگر تھوڑے دن اور زمانے نے دیکھ لیا کہ جن لوگوں نے کسی طور پر بھی نبی علیہ السلام کی ازواج مطہرات کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا وہ لوگ کس طرح ذلیل ہو کر مدینۃ النبی سے نکلے۔

اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا جا سکتا ہے کہ امہات المومنین کے گستاخوں سے مداہنت برتنے والے اور ان کا تعاقب نہ کرنے والے بھی اسی گروہ سے گویا بالواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔

اور اس فیصلہ کن ارشاد نے اس بات کا فیصلہ کر کے رکھ دیا کہ ملعونین ایسے لوگ ہیں اینما ثقفوا جہاں پائے جائیں اخذوا پکڑے جائیں وقتلوا تقتیلا۔ اور قتل کئے جائیں خوب قتل کرنا ایک بازنگاہ بازگشت ڈالئے اور تمام مفہوم کو ذہن میں حاضر کیجئے اور دیکھئے کہ امہات المومنین کا مقام قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کن الفاظ میں اور کس انداز سے بیان فرمایا ہے

دُنیا میں اس وقت بڑے بڑے مذاہب تقریباً پانچ ہیں۔ عیسائیت، یہودیت، بدھ ازم، ہندویت اور اسلام عیسائیت میں مذہبی نقطہ نگاہ سے عورت گناہوں کی گٹھڑی، رذالت کی پوٹ اور عصیان و طغیان کی طرف کھینچنے والا مجسمہ ہے اور زمانہ دراز تک عیسائیت نے عورت کو زندگی کے ہر شعبہ میں نظر انداز کئے رکھا مگر آج وہی عورت ان کا نصف بہتر (BETTER HALF) بلکہ میں کہوں گا ان کے سر پہ سوار ہو چکی ہے یہودیت کا حال بھی یہی کچھ ہے۔ بدھ ازم کے بانی نے

عورت کے وجود کو اتنا ناپاک سمجھا کہ آدھی رات کو اُسے بے خبر چھوڑ کر اور شیر خوار بچے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گھر سے بھاگ نکلا۔ مگر آج اُن لوگوں نے بھی عورت کو ایک اعلےٰ مقام پر بٹھا رکھا ہے۔ ہندو مذہب میں عورت داسی تھی، خادمہ تھی۔ ہیچ محض تھی اور اُسے ذلت کے اس مقام پر پہنچا دیا گیا تھا کہ خاوند کے مرنے پر اُسے بھی مرنیوالے کے ساتھ زندہ ہی جلا دیا جاتا تھا۔ مگر آج وہی داسی دیوی شرمتی اور ماتا ہے۔ ان مذاہب میں یہ ذہنی انقلاب کیسے پیدا ہوا۔ اس طرف کسی نے غور نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اسلامی تعلیمات اور اسلامی نظریات اندلس کے راستے محسوس اور غیر محسوس طریقوں سے یورپ کے براعظم میں پھیلے تو یہاں والوں نے عورت کے مقام کو پہچانا اور اس پر عمل پیرا ہوئے اور جب ان لوگوں نے ربع مسکونہ کو اپنی گرفت میں لیا تو مفتوحہ اقوام نے الناس علےٰ دین ملوکھم کے مصداق اپنے اُس مذہبی جنوں کو آہستہ آہستہ کم کرنا شروع کر دیا جو ان کے ذہنوں میں عورتوں کی ذلت کا موجب تھا۔

مگر دین اسلام ـــــ جسکی تعلیمات کے اثر نے دنیا بھر کی عورتوں کو عزت کا مقام بخشا اُس دین کے بزعم خویش پیروکار آج یہ بھی نہیں جانتے کہ جن ذوات قدسیہ وطاہرہ کے طفیل عورت کو یہ مقام ملا قرآن نے ان کے فضائل و شرف کن الفاظ میں بیان کئے ہیں۔ نبی علیہ السلام نے اس بھری دنیا کے اندر بظاہر جنکو اپنی ذات کے لئے مگر بباطن تمام دُنیا پر پھیلی ہوئی صنف اناث کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ ان کے شرف و منزلت کو بالکل بھول گئے۔

دشمنان دین اسلام نے اسلام کی خوبیاں اپنا کر جب شاہراہ حیات پر اپنا ایک مقام متعین کر لیا تو اپنے محسن اعظم حضور صادق و مصدوق کی ذات اقدس کے خلاف جو زہر افشانی شروع کی، اس کی ایک شق یہ بھی تھی کہ پیغمبر علیہ السلام نے اتنی عورتوں کے ساتھ کیوں نکاح فرمایا۔ اور اس کیوں کے پس منظر میں تمسخر، تضحیک اور طعنہ زنی کی وسیع دُنیا سمائی ہوئی تھی۔ میری ابتدائی زندگی میں چند ایسے مواقع آئے کہ میں اس قسم کے اعتراضات کے جوابات کے لئے اپنے دینی

ذخیرہ میں غوطہ زن ہو کر ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ مگر کہیں کچھ سجھائی نہ دیا۔ نظر آیا تو یہ کہ نبی علیہ السلام میں چالیس مردوں کی طاقت تھی۔ مگر جب اس بات پر غور کیا تو یہی دیکھ سکا۔ "دیکھا جو تیر کھا کے کمینگاہ کی طرف" اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ غور کیجئے۔ ۵۰ سال کی عمر تک ایک بیوی اس کے فوت ہونے پر جن سے نکاح فرماتے ہیں ان میں سے ایک کی عمر ۵۰ سال اور دوسری کی عمر چھپن سال مگر ان کی رخصتی عمل میں نہیں لائی گئی۔ پھر یعنی چھپن ستاون سال کی عمر کے بعد کاشانۂ نبوت میں امہات المومنین کی تعداد بڑھنا شروع ہوئی۔ آپ کی مدنی زندگی کو اگر غزوات و سرایا پر تقسیم کیا جائے اور وفود کی تعداد کا جائزہ لیا جائے تو آنحضرتؐ کی مصروفیات کا نقشہ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے کہ ہر مہینے ایک غزوہ یا سریہ کا انتظام فرما رہے ہیں۔ اصحاب صفہ کی ذمہ داریاں، وفود کا انتظام غزوہ تبوک، صلح حدیبیہ فتح مکہ اور حجۃ الوداع کے طویل سفر پھر غزوہ خندق کی وزلزلوا زلزالاً شدیداً قسم کی مصروفیات، تہجد، فرض نمازوں کے لئے وقت، شب بیداری، ایلاء کا مہینہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کا ایک ایک لمحہ مصروفیات سے پُر تھا۔ اور یہاں ہمارے بزعم خویش مزاج شناسانِ منصبِ نبوت و رسالت کی تمام علمی فضیلتوں کا زور صرف اس قسم کی باتوں پر صرف ہو رہا ہے کہ آپ صلے اللہ علیہ وسلم میں چالیس مردوں کی طاقت تھی۔ آخر وہ ایسی باتوں سے عوام کو کیا تاثر دینا چاہتے ہیں۔

پھر اس امر پر بھی غور کیجئے کیا سیدہ خدیجہ اور سیدہ ماریہ قبطیہؓ کے علاوہ تمام امہات المومنین اولاد پیدا کرنے کی صلاحیتوں سے محروم تھیں حالانکہ ان میں سے بعض کے ہاں پہلے خاوندوں سے اولادیں موجود ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ نبی علیہ السلام نے ذوات قدسیہ کو شرف زوجیت سے ممتاز فرمایا ان میں سے ہر ایک علم، معرفت، درائیت، ذکا، ذہن، فہم، وطنیت جودت نظر، ذکاوت، دقت نظر، خوش تدبیری اور صحت فکر کا شہکار عظیم تھیں۔ ایک طرف جو کام ایک لاکھ چالیس ہزار صحابہ کرامؓ نے کیا جن میں سے بارہ ہزار کے حالات سے ہم واقف ہیں دوسری طرف ان دوازدہ مطہرات نے وہ کام کر کے دکھا دیا۔ یہی وہ نکتہ ہے جو لستن

کا حدمن النساء یطہرکم تطہیرًا اور ولا ان تبدل بھن میں پوشیدہ ہے۔

میں آپ کا بہت وقت لے چکا ہوں۔ اب تبرکًا نہایت اختصار سے امہات کے حالات سن لیجئے۔

صدیقہ کائنات نے اُمت کیلئے نصف بلکہ تین چوتھائی دین کے مسائل کا ذخیرہ بہم پہنچایا۔ آپکے خاندان کی چار پشتیں شرفِ صحابیت سے ممتاز تھیں۔ سیّدہ حفصہ رضی فاروق اعظم رضی کی دختر تھیں۔ صدیقہ کائنات رضی کی طرح غیر معمولی قابلیت وصلاحیت کی مالک تھیں معلّم اعظم ص سے کتاب وحکمت کا درس لے کر ہمیشہ اسکی نشر واشاعت میں سرگرم رہیں۔ نیاز فتح پوری کہتے ہیں ان کو تعلیم وتفہیم کا بڑا شوق تھا بہت سی صحابیہ اور تابعی خواتین ان کے دائرہ تلامذہ میں داخل تھیں۔ ابوداؤد اور مستدرک حاکم کی روایات کے مطابق آپ فن کتابت کی ماہر تھیں۔ آپنے اس صلاحیت سے بھرپور استفادہ اٹھایا۔ آپ کے مرتب کردہ نسخہ قرآن کو سامنے رکھکر قرآن مجید کو مرتب کیا گیا۔ تفقہ فی الدین میں آپ کا مقام منفرد تھا۔ مسند اور طبقات میں ہے ایک بار نبی علیہ السلام نے فرمایا مجھے امید ہے کہ اصحاب حدیبیہ جہنم میں داخل نہیں ہوں گے۔ سیّدہ حفصہ رضی نے کہا اللہ تعالےٰ فرماتا ہے وَ ان منکم الا واردھا۔ آنحضرت ص نے فرمایا ہاں مگر یہ بھی تو ہے ثم ننجی الذین اتقوا ونذر الظالمین فیھا جثیا۔ آپ سے ۶۰ احادیث مروی ہیں۔

ام المؤمنین سیّدہ سودہ کی عمر نکاح کے وقت ۵۰ سال تھی۔ آپ نے بنات الرسول ص کی تربیت کا فریضہ کما حقہ، ادا کیا۔

ام المومنین سیّدہ زینب بنت خزیمہ کا نکاح ۳ ھ میں ہوا اور جلد ہی انتقال فرماگئیں۔

اُم المؤمنین سیّدہ ام سلمہ رضی ۴ ھ میں کاشانۂ نبوت کی زینت بنیں۔ ہماری یہ جلیل القدر اور عظیم الشان ماں ہمارے لئے صبر، حوصلہ، ہمت، استقلال اور قربانی کا وہ بے نظیر سرمایہ چھوڑ گئی ہیں جس کی مثال تاریخ عالم پیش کرنے سے

صرہے - ابن اثیر میں ہے آپ فرماتی ہیں میں نے اپنے خاوند کے ساتھ پہلی ہجرت بشہ کی طرف کی - پھر مکہ واپس آ گئے - مکہ سے ہجرت کے ارادہ سے نکلے تو میرے میکے کے لوگوں نے مزاحمت کی کہ ہم اپنی لڑکی کو نہیں جانے دیں گے - اور میرے خاوند ابوسلمہ کے ہاتھ سے اونٹ کی نکیل چھین کر چل نکلے - اتنے میں ابوسلمہؓ کے خاندان والے آ گئے اور انہوں نے ابوسلمہ سے بچہ چھین لیا - اب میں، میرا شوہر اور میرا بچہ الگ الگ تھے - ابوسلمہ مدینہ پہنچ گئے - آپ روزانہ صبح گھر سے نکلتیں اور سارا دن اس ٹیلے پر بیٹھی روتی رہتیں جہاں سے بچہ اور خاوند الگ کیے گئے تھے۔
کم و بیش ایک سال اسی حالت میں گذر گیا - آخر ایک آدمی کو ترس آ گیا اور اسکی ترغیب سے میرے خاندان والوں کو مجھ پر ترس آ گیا مجھے بچہ مل گیا اور میں بالکل تنہا اونٹ پر سوار ہو کر عازم مدینہ ہو گئی - تنعیم کے مقام پر اچانک عثمانؓ بن طلحہ مل گئے اور انہوں نے مجھے مدینہ پہنچا دیا - بقول اسد الغابہ آپ اکثر فرمایا کرتی تھیں کہ اہل بیت میں سے اسلام کی خاطر کسی نے وہ مشکلات نہیں اٹھائیں جو خاندان ابو سلمہ کو اٹھانی پڑیں - نکاح کے بعد نبی علیہ السلام نے آپ کو بھی دوسری ازواج مطہرات کی طرح بقول ابن سعد دو چکیاں دو مشکیزے ایک چمڑے کا تکیہ مرحمت فرمایا - صلح حدیبیہ کے موقعہ پر آپ نے قربانی کے متعلق نبی علیہ السلام کی خدمت میں نہایت صائب مشورہ عرض کر نیکی سعادت حاصل کی - مسند احمد بن حنبل کی روایت کے مطابق سیدنا حسینؓ کے المیہ سے اللہ تعالےٰ نے خواب میں آپ کو آگاہ فرما دیا تھا - آیت تطہیر آپکے حجرہ مبارک میں ہی نازل ہوئی تھی - ۶۲ ھ میں انتقال فرمایا - اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۱۳ پر مرقوم ہے کہ آپ کے فتاوے اگر قلمبند کیے جائیں تو ایک رسالہ تیار ہو سکتا ہے طبقات جلد دوم میں ہے کہ حفظ احادیث میں حضرت صدیقہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کا کوئی حریف نہ تھا -

ام المؤمنین سیدہ زینب بنت جحش بعمر ۳۶ سال ۵ ھ میں کاشانۂ نبوت کی زینت بنیں - ابن اثیر کے قول کے مطابق السابقون الاولون میں سے ہیں - آپکا یہ احسان قیامت تک امت کے سر رہے گا کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُم وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ اور اُدعُوهُم لِاٰبَائِهِم کا نزول

آپ کی وجہ سے ہی ہوا ۔ آپ نہایت فیاض، فراخ دست، متوکل اور قانع تھیں ابن سعد کی روایت کے مطابق یتامیٰ و مساکین کی مہر پرست فقراء کی پشت پناہ اور مساکین کی ملجاء و ماویٰ تھیں فاروق اعظمؓ نے بارہ ہزار درہم وظیفہ مقرر فرمایا۔ مگر صرف ایک بار یہ کہتے ہوئے قبول فرمایا اے اللہ آئندہ یہ مال مجھکو نہ پائے نہایت خاشع خاضع عبادت گذار تھیں۔ صحابہ کی روایت کے مطابق ایک بار نبی علیہ السلام نے آپکو اواہ فرمایا۔

صدیقہ کائنات فرماتی ہیں آپ معاملات دین، تقوے، صداقت، صلہ رحم، سخاوت اور ایثار نفس میں بے مثل تھیں آپ کی وفات پر طبقات کی روایت کے مطابق سیدہ کائنات کا ارشاد بھی سن لیجئے ۔ آپنے فرمایا ۔ وہ نیک بخت بے مثل بیوی چلی گئیں اور یتامیٰ اور بیوگان کو بے چین کر گئیں۔

حضرت جویریہ بنت حارث کو ۲۰ سال کی عمر میں ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اسد الغابہ میں ہے صدیقہ کائناتؓ فرماتی ہیں کہ میں نے جویریہ سے بڑھ کر کسی عورت کو اپنی قوم کے لئے وجہ برکت نہیں دیکھا ۔ حرم نبویؐ میں داخل ہونے کے بعد آپ کے والد حارث بہت سا مال لے کر خدمت نبویؐ میں حاضر ہوئے ۔ مگر جب دیکھا کہ بیٹی کاشانۂ نبوت کی زینت بن چکی ہے تو بڑے خوش ہوئے اور اسلام قبول کر لیا ۔ قبیلہ بنو مصطلق کے تمام قیدی آپ کے مہر میں آزاد فرما دیئے گئے ۔ یہ روایت ام المومنین حضرت جویریہؓ سے ہی تعلق رکھتی ہے کہ نبی علیہ السلام نے آپ کو صبح کے وقت دیکھا تو آپ مسجد میں تھیں دوپہر کو دیکھا تو مسجد میں ہیں تو فرمایا میں تمہیں ایسے کلمات نہ سکھا دوں جنکا پڑھنا تمہاری اس نفلی عبادت پر ترجیح رکھتا ہے ۔ پھر آپنے سبحان اللہ وبحمدہ عدد خلقہ کے کلمات تعلیم فرمائے ۔ ابن عباس، جابر، ابن عمر، عبید بن السباق ابو ایوب مراغی، مجاہد، مکبیر، کلثوم، عبداللہ بن شداد نے آپسے حدیث بیان کی ہے ۵۶ھ میں وفات پائی اور امیر مدینہ سیدنا مروان بن الحکم نے نماز جنازہ پڑھائی۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ بنت سیدنا ابوسفیان کا ۶ھ میں نکاح ہوا اپنے خاندان میں سب سے پہلے معہ اپنے خاوند عبیداللہ مشرف باسلام ہوئیں ۔ ہجرت کر کے حبشہ چلی گئیں۔ وہاں جاکر عبیداللہ عیسائی ہو گیا ۔ ایک رئیس ابن رئیس کی بیٹی، رئیس کی بیوی اور یوں

بیوگی اور غربت مگر اسلام کے ساتھ شیفتگی اور خاندانی وجاہت کے عزم و حوصلہ کو دو آتشہ کر دیا۔ عدت کے دن پورے ہوتے ہی نجاشی نے نبی علیہ السلام کے ساتھ نکاح پڑھایا۔

اس وقت حضرت ام حبیبہؓ کی عمر ۳۶ سال کے قریب تھی۔ نہایت مستحکم ایمان تھیں حضرت ابوسفیان کو معلوم ہوا تو باوجود اس بات کے کہ وہ ابھی تک ایمان نہیں لائے تھے بہت خوش ہوئے۔ طبقات اور صحیح بخاری کی روایات کے مطابق باپ کے انتقال پر خوشبو استعمال فرمائی اور کہا اگر میں نے رسول اللہ کو یہ فرماتے نہ سنا ہوتا کہ ایماندار عورت کے لئے تین دن سے زیادہ کسی کا سوگ جائز نہیں بجز شوہر کے کہ اسکی مدت چار مہینے دس دن ہے تو ایسا نہ کرتی آپ کی مرویات کی تعداد ۶۵ ہے۔ ۴۴ ہجری میں بعمر ۷۳ سال وفات پائی۔

ام المومنین صفیہ بنت حییؓ۔ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد سے تھیں۔ باپ اور نانا اپنی قوم کے باوقار سردار تھے فتح خیبر کے موقع پر قیدیوں میں شامل تھیں نبی علیہ السلام نے آزاد فرما کر نکاح فرمالیا۔ انتہائی حلیم مزاج ضابطہ بے انتہا فیاض سیر چشم، ہمدرد اور رقیق القلب تھیں، سیدنا ذوالنورینؓ جب قصر خلافت میں محصور کر دیئے گئے تو آپ پانی کی چھاگل لے کر خچر پر سوار ہو کر اُن کے محل کی طرف روانہ ہوئیں۔ اشتر نخعی آپ کے خچر کے منہ پر مارنے لگا تو آپ واپس لوٹ گئیں۔ مسند احمد بن حنبل کی روایت ہے کہ مہیرہ بنت حیضرج کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تو دیکھا کہ کوفہ کی بہت سی عورتیں آپ کو گھیرے ہوئے ہیں اور مختلف قسم کے مسائل دریافت کر رہی ہیں اور آپ سب کا جواب نہایت حسن ادا سے دے رہی ہیں وفات ۵۰ ہجری میں ہوئی ایک لاکھ دینار ترکہ میں چھوڑے جو آپ کی وصیت کے مطابق تقسیم ہوئے ام المومنین میمونہ بنت حارثؓ سے ۷ ہجری میں بعمر ۳۶ سال نکاح ہوا۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ صدیقہ کائناتؓ نے فرمایا کہ میمونہ ہم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والی اور صلہ رحمی کا خیال رکھنے والی ہے۔ اور امر و نواہی کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ تفقہ فی الحدیث میں خاص مقام رکھتی تھیں۔ سب سے آخر میں وفات پائی۔

ام المؤمنین ماریہ قبطیہ۔ مصر کی شہزادی تھیں۔ ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ کے بعد انہیں کے ہاں ابراہیم پیدا ہوئے۔

سجدۂ تعظیمی

غازی عزیز محلہ شیخاں اپرفورٹ علی گڑھ (انڈیا)

سجدہ بغیر اللہ کے متعلق بعض لوگوں کا گمان ہے کہ یہ پچھلی شریعتوں میں جائز تھا جو بعد کو ممنوع قرار دیا گیا۔ جب کہ حقیقت اِس سے مختلف ہے۔ اگرچہ بعض مفسّرین نے بھی اپنی تفاسیر میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں اس قسم کے سجدہ کا ذکر دو جگہ ملتا ہے۔ (۱) جب حضرت یوسف علیہ السّلام کے سامنے اُن کے بھائی اور اُن کے باپ (حضرت یعقوب علیہ السّلام) سجدہ میں گر گئے۔ (۲) جب حضرت آدم علیہ السّلام کو تمام ملائکہ نے سجدہ کیا۔

پہلے سجدہ کے متعلق تحقیق سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ درحقیقت وہ سجدہ نہ تھا بلکہ اس دور میں سلام کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ اور حضرت یعقوب علیہ السّلام اور حضرت یوسف علیہ السّلام کے بھائی وغیرہ سجدہ میں گر گئے۔ اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ انہوں نے پیشانی زمین پر ٹیک دی ہو۔ اکثر مفسّرین یہ بتاتے ہیں کہ: "کچھ جھک گئے تھے!"۔ چنانچہ صاحبِ تفسیرِ جلالین لکھتے ہیں: وخروا ای ابواہ واخوتہ لہ سجّدًا؟ سجود انحناءٍ او وضع جبہۃ وکان تحیتھم فی ذٰلک الزمان۔" یعنی یوسف علیہ السلام کے بھائی اور والدین ان کے سامنے سجدہ میں گر گئے یعنی جُھک گئے، یہ نہ تھا کہ ماتھا (پیشانی) زمین پر ٹیک دیا ہو۔ اور اُس وقت اُن کے سلام بجالانے کا یہی طریقہ تھا!۔ (جلالین شریف)

اس لفظِ سجدہ اور اسلامی اصطلاح کے سجدہ میں بہت فرق ہے۔ اس جگہ سجدہ کے معنی صرف جھکنے کے ہیں۔ جس کی کثرت سے مثال عربی بائیبل میں بھی ملتی ہے۔ اس سجدہ کی حقیقت انتہائی عام فہم انداز پر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اس طرح لکھتے ہیں "اِس مضمون کی مثالیں بڑی کثرت سے بائبل میں ملتی ہیں اور اُن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اِس سجدہ کا مفہوم وہ ہے ہی نہیں جواب اسلامی اصطلاح کے لفظ سجدہ سے سمجھا جاتا

ہے۔ جن لوگوں نے معاملہ کی اس حقیقت کو جانے بغیر اُس کی تاویل میں سرسری طور پر لکھ دیا ہے کہ اگلی شریعتوں میں غیراللہ کو تعظیمی سجدہ کرنا یا سجدہ تحیۃ بجالانا جائز تھا۔ انہوں نے محض ایک بے اصل بات کہی۔ اگر سجدہ سے مُراد وہ چیز ہو، جسے اسلامی اصطلاح میں سجدہ کہا جاتا ہے تو وہ خدا کی بھیجی ہوئی کسی شریعت میں کبھی کسی غیراللہ کے لئے جائز نہیں رہا ہے!" (تفہیم القرآن ج ۲ صـ۴۳۲)

صاحبِ معالم التنزیل بھی اس سجدہ کو اس دَور کا تحیۃ وتقبیل اور تکریم وسلام کا طریقہ بتاتے ہیں۔ حضرت ابوالفضل شہاب محمّد آلوسیؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ اس دَور میں سلام کا طریقہ تھا اور اس طرح پر نہ تھا کہ پیشانی زمین پر ٹیک دی ہو، بلکہ ذرا سے جُھک گئے تھے۔ اسی تفسیر میں موصوف آگے لکھتے ہیں : ما کان ذٰلك الا يماء بالرأس (تفسیر رُوح المعانی ج ۱۳ صـ۵۸) "یعنی یہ محض سر سے اشارہ تھا" : كان كالركوع البالغ دون وضع الجبهة على الارض" یعنی یہ رکوع جیسا تھا نہ کہ پیشانی زمین پر رکھی!" (تفسیر روح المعانی)۔ المراد به التواضع ويراد بالخرور المرور كما فى قوله تعالى (والذين إذا ذكروا بآيات ربهم لم يخروا عليها صما وعميانا) یعنی "اس خرور سے مراد عاجزی کے ساتھ گزرنا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے : (والّذين إذا ذكروا..... الخ)۔ (تفسیر رُوح المعانی) المراد بمروا عليها كذلك، وانت تعلم أن اللفظ ظاهر فى السقوط (تفسیر روح المعانی)

الامام ابوجعفر محمّد ابن جریر الطبریؒ نے بھی اسی حقیقت کو کافی وضاحت کے ساتھ اپنی مایۂ ناز تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں لکھا ہے :

مفسّرِ قرآن حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سجدہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے لئے نہ تھا، بلکہ وہ تمام اللہ کے سامنے بطور شکر یہ سجدے میں گر گئے تھے اس زبردست نعمت پر کہ جس سے خدا تعالیٰ نے انہیں سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ امام ابوالفضل شہاب آلوسیؒ لکھتے ہیں :- ونسب لابن عباس ان المعنى خروا لأجل يوسف سجدا لله شكرا على ما أوناهم فى النعمة (روح المعانی)۔ سیّد قطب شہیدؒ نے بھی اسی قول کو ترجیح دی ہے، موصوف لکھتے ہیں : ذلك فى ضمير الغيب (ملاحظہ ہو فی ظلال القرآن الجزء الحادی عشر صـ۲۶)۔ صاحبِ معالم التنزیل مندرجہ بالا توضیح کے بعد آگے لکھتے ہیں کہ لهٗ کی ضمیر

اللہ تعالیٰ کے لئے ہے کہ نہ حضرت یوسف علیہ السّلام کے لئے۔ تفسیر الکاشف میں بھی اس آیت کی تفسیر اس طرح لکھی ہوئی ہے: ان ضمیر له عائد الی الله وان السجود کان شکرا له تعالیٰ علی هذه النعمة الکبری (التفسیر الکاشف ج ۴ ص ۳۵۹-۳۵۸)

امام آلوسیؒ اپنی تفسیر میں ایک جگہ لکھتے ہیں،

وذکر الامام أن القول بأن السجود کان لله تعالیٰ لا لیوسف علیه السلام حسن، والدلیل علیه ان قوله تعالیٰ (ورفع أبویه علی العرش وخروا له سجدا) مشعر بأنهم صعدوا ثم سجدوا ولو کان السجود لیوسف علیه السلام کان قبل الصعود والجلوس لأنه أدخل فی التواضع بخلاف سجدوا الشکر لله تعالیٰ ..... الخ ثم قال: وهو متعین عندی لانه یبعد من عقل یوسف علیه السّلام ودینه أن یرضی بأن یسجد له أبوه مع مسابقته فی حقوق الولادة والشیخوخة والعلم والدین کاکمال النبوة (روح المعانی) ترجمہ (یعنی امام نے ذکر کیا کہ سجدہ اللہ تعالیٰ کے لئے تھا نہ کہ یوسف علیہ السّلام کے لئے اور اس کی دلیل موصوف نے یہ پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مطابق یوسف علیہ السّلام نے اپنے والدین کو عرش (تخت) پر بٹھایا اور وہ اس کے سامنے سجدہ میں گر گئے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلے وہ لوگ عرش پر چڑھے اور پھر سجدہ کیا۔ اگر سجدہ یوسف علیہ السلام کو ہوتا تو عرش (تخت) پر چڑھنے اور بیٹھنے سے قبل ہوتا کیونکہ یہی تواضع میں قرین مصلحت ہے کیونکہ یوسف علیہ السّلام جیسے پیغمبرِ خدا کی عقل، دیانت وصیانت سے بعید ہے کہ وہ اس سے خوش اور راضی ہوں کہ اُن کے والدین انھیں سجدہ کریں جب کہ وہ ولادت شیوخت، علم، دین اور کمالِ نبوّت میں مقدّم ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ سجدہ یقیناً یوسف علیہ السّلام کو نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کو تھا۔ (تفسیر روح المعانی)

امام ابن جریرؒ طبریؒ بھی اس حقیقت کا اعتراف اپنی تفسیر جامع البیان فی تفسیر القرآن میں کرتے ہیں۔ اگر بفرضِ محال اسے سجدہ مان بھی لیا جائے تو بھی سجدۂ تعظیمی لغیر اللہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اِس سے سابقہ شریعتوں میں اِس کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر حضرت یوسف علیہ السّلام کو اُن کے والد محترم حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا بھی ہوگا تو خدا تعالیٰ کے حکم پر کیا ہوگا جس کی مصلحت ہم کو معلوم

نہیں - اور یہ نہایت ممکن ہے کہ حضرت یوسف علیہ السّلام اس مصلحتِ خداوندی سے واقف ہوں اور اسی وجہ سے خاموش رہے ہوں - اور اگر ایسا خدا تعالیٰ کا حکم نہ ہوتا تو حضرت یوسف علیہ السّلام کے علم، دین، حقوقِ ولادت، عقل اور کمالِ نبوّت سے بعید ہے کہ وہ اپنے والد ہی کو نہیں بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبرِ خدا کو اپنے سامنے سجدہ کرنے دیتے، اسی بات کو امام آلوسیؔ تحریر فرماتے ہیں :- وبانہ یحتمل أن یکون اللہ تعالیٰ قد امر یعقوب بذلک لحکمۃ لا یعلمھا إلّا ھو وکان یوسف علیہ السلام عالما بالأمر فلم یسعہ الا السکوت والتسلیم۔ (روح المعانی)

اگر قرآن کی اس آیت (ادخلوا الباب سجّدًا) کے لفظ سجّدًا کی، معنی کے اعتبار سے تحقیق کی جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عربی زبان میں لفظِ سجدہ صرف پیشانی زمین پر ٹیک دینے کے معنی میں مستعمل نہیں ہے، بلکہ فروتنی سے جھکنے کے لئے بھی مستعمل ہے - چنانچہ عربی لغت میں لکھا ہے سَجَدَ سُجُودًا کا معنی انحنی خاضعًا (یعنی فروتنی سے جھکنا) مثلاً عَیْنٌ سَاجِدَۃٌ (جھکی ہوئی آنکھ) اور نَخْلَۃٌ سَاجِدَۃٌ (جھکا ہوا کھجور کا درخت) ملاحظہ ہو "المنجد" صـ ۳۲۹)

دوسرے سجدہ (یعنی ملائکہ کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا) سے بھی کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پچھلی شریعتوں میں غیر اللہ کے لئے سجدۂ تعظیمی جائز تھا - اس سجدہ کا مقصود تو یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السّلام کو اشرف المخلوقات کا شرف عطا فرمایا جائے اور اس وقت کی موجودہ مخلوق کا امتحان لیا جائے - ویسے بھی یہ سجدہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ملائکہ نے کیا تھا خود تعظیمًا اُن سے سجدہ ثابت نہیں ہے - ظاہر ہے حضرت آدم علیہ السّلام کو ان کی پیدائش کے وقت نہ تو نبوّت کا مقامِ بلند ملا تھا اور نہ ہی کسی شریعت کا وجود تھا - بعد نبوّتِ آدم علیہ السّلام ملائکہ نے اگر سجدہ کیا ہوتا تو کسی شریعت میں اس کے جواز کی گنجائش پیدا ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے !

السجود لغیر اللہ کے متعلق رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: "لا ینبغی لأحد أن یسجد لأحد الا للہ!" ترجمہ: نہیں مناسب ہے کہ سجدہ کرے کوئی اللہ کے سوا کسی غیر کو (الحدیث) - الامام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شرک کی دو قسمیں ہیں - ایک شرکِ اکبر اور دوسرا شرکِ اصغر - جو شخص دونوں قسم کے شرک سے بچ جائے اس کے لئے جنّت واجب

ہے اور جو شرکِ اکبر (مثلاً سجدہ یا نیاز لغیر اللہ وغیرہ) پر مرا اس کے لئے جہنم واجب ہے!" (تنبیہ ہو عزیز الحمید) - خدا تعالیٰ خود فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ (سورۃ النساء آیت ۴۸) مترجمہ: (اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کا شریک مقرر کیا اس نے بڑا بہتان باندھا!) (سورۃ النساء)

تمام مخلوق بشمول ملائکہ و انبیاء علیہم السّلام خدا تعالیٰ کے بندے ہیں اور جب کہ ہم سب یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب، جہاں، جس جگہ، جس طرح بھی اُس کا (خدا تعالیٰ کا) حکم ہو، اس کو ویسے ہی بجا لانا اصل عبدیّت ہے - اگر فرشتوں نے خدا تعالیٰ کے حکم سے حضرت آدم علیہ السّلام کو اور حضرت یوسف علیہ السّلام کو حضرت یعقوب علیہ السّلام اور ان کے (حضرت یوسف علیہ السلام کے) بھائیوں نے سجدہ کیا، تو یہ تو حکم الٰہی کی تعمیل تھی - اس لئے اس سے کسی طرح بھی اِس کا جواز پچھلی شریعتوں میں ثابت نہیں ہوتا - کیونکہ اُن سب نے تو اپنا حقّ بندگی ادا کیا تھا - اُن سجود کو سجودِ تعظیمی ماننا عظیم گمراہی ہے، چونکہ تحقیق شدہ امر ہے کہ سجدۂ تعظیمی نہ کسی پچھلی شریعت میں جائز تھا، نہ اب ہے اور نہ کبھی ہوگا کیونکہ اب کوئی دوسری شریعت نہیں آنے والی ہے، واللہ اعلم بالصّواب!

بقیہ "عیدِ یُنے" صک سے آگے

یہ ہوسکے جو اُن کے خالق و مالک کو پسند ہیں، اسی طرح یہ زکوٰۃ الفطر درحقیقت روزوں کو معصیت کی آلودگی سے پاک کرنے کا ذریعہ بنتی ہے - البتّہ جس طرح فرض زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظامِ عدل و انصاف کا اہم رکن ہے اور اس کے ذریعے معاشرے کے ان لوگوں کی کفالت ہوتی ہے جو کسی سبب سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں اور اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہوسکتے ہوں - اسی طرح زکوٰۃ الفطر سے عید کے روز مسلمانوں کی عام خوشی میں پسماندہ لوگوں کی شرکت و شمولیّت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے - اللہ ہمیں اوّلاً ماہِ صیام کی برکتوں سے کما حقّہٗ مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور اس مبارک مہینے کے اختتام پر عید کے روز صدقۂ فطر ادا کرنے کی توفیق بھی دے تاکہ ہمارے غریب بھائی عید کی خوشیوں میں ہمارے ساتھ شریک ہوسکیں - آمین ثم آمین ۔ ☆

تعارف و تقدیم

"قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین رضؓ"

تالیف: امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ

از: پروفیسر یوسف سلیم چشتی مدظلہٗ

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی معرکۃ الآرا تصنیف "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" عرصہ سے نایاب تھی۔ اب بحمداللہ لاہور کے ایک ناشر "المکتبۃ السلفیہ" نے اس کے اصل متن کو بھی شائع کر دیا ہے اور عوام کی غرض سے پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اسے اُردو کے قالب میں بھی ڈھال دیا ہے۔ کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل یہ ترجمہ انشاء اللہ قسطوار "میثاق" میں شائع ہوتا رہے گا۔ اس ضمن میں "تعارف و تقدیم" اس اشاعت میں پیش خدمت ہے۔ (مدیر)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف لفظوں میں متنبہ فرما دیا تھا کہ "وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا" اور (دیکھو) مشرکوں میں سے مت ہو جانا (یعنی) ان لوگوں میں سے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بہت سے گروہ ہو گئے (۳۰ - ۳۱)

نیز اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بایں الفاظ مخاطب کیا "إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔ (۶ - ۱۵۹) جن لوگوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور وہ بہت سے گروہ ہو گئے (تو اے رسولؐ) آپ کا اُن سے کوئی تعلق نہیں ہے (کیونکہ وہ آپؐ کی تعلیم سے منحرف ہو چکے ہیں)

اللہ نے اس بات کو بھی واضح فرما دیا کہ مقصدِ حیات تو جہاد بالسیف ہے لیکن اگر تم مختلف گروہوں میں منقسم ہو گئے تو نزاع یقینی ہے اور جب تم آپس ہی میں لڑنے لگو گے تو تمہارے اندر بزدلی پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی" (۸ - ۴۶)

صحابۂ کرامؓ نے اللہ کی ان نصیحتوں پر سچے دل سے عمل کیا اور حضورؐ کی وفات کے بعد صرف بیس سال کے قلیل عرصے میں (۱۱ ھ تا ۳۰ ھ) افغانستان سے لے کر مراقش تک اسلام کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ دنیا کی پوری تاریخ میں یہ واقعہ بے نظیر و بے مثال ہے۔

جس طرح یہودیوں کو نصرانیت سے زبردست عناد تھا اور اسی عناد کی وجہ سے اُنہوں نے حضرت مسیحؑ کے مذہب کو مسخ کر دیا (جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے) اسی طرح اِن یہودیوں کو اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید عناد تھا۔ بفحوائے الفاظ قرآنی : لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ (الآیہ : المائدہ - ۸۳) یعنی تم اہل ایمان سے دشمنی میں سب سے زیادہ شدید پاؤ گے یہودیوں کو۔

پس ۳۰ ھ میں ایک یہودی نے جس کا نام عبداللہ ابن سبا تھا ، منافقانہ طور پر اسلام قبول کیا اور امام مظلوم حضرت عثمان ذوالنورین شہید فی سبیل اللہ کے عہدِ خلافت میں ، بصرے ، کوفے اور مصر میں ان غیر اسلامی عقائد کی تبلیغ شروع کر دی کہ

۱ : ہر نبی کا ایک وصی ہُوا کرتا ہے ، چنانچہ حضرت علی ، آنحضرت صلعم کے وصی ہیں اور اس لیے مسلمانوں کے امام ہیں۔

۲ : وصی ، نبی یا رسُول کا جانشین ہُوا کرتا ہے ، کیونکہ رسُول یا نبی اسے اپنی وفات سے پہلے اپنا جانشین مقرر کر دیتا ہے۔

۳ : وصیٔ رسُول اپنے منصب کے اعتبار سے امام بھی ہوتا ہے اور امامت

اس کی اولاد میں نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہتی ہے۔

۴ : یہ وصی اور امام، حقیقی جانشینِ رسُول ہوتا ہے اور نبی کی طرح معصوم عن الخطا اور موردِ وحی و الہام ہوتا ہے۔

۵ : چونکہ مسلمانوں نے حضرت علی کو ان کے جائز "حق" سے محروم کردیا ہے اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ان غاصبوں (فاسقوں، فاجروں بلکہ منافقوں) سے جنگ کریں اور حضرت علی کو ان کا حق دلائیں۔

۶ : حضرت ابوبکرؓ، عمر فاروقؓ اور عثمان غنی تینوں "غاصب" ہیں اور ان کے متبعین دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ یہ لوگ منافقانہ طور پر اسلام لے آئے تھے۔

۷ : اُنہوں نے قرآن میں بھی تحریف کی ہے اور حضرت علی کے جمع کردہ قرآن کو ردّ کر دیا ہے۔

اس دشمن اسلام منافق عبداللہ ابن سبا نے اپنے مبلغین کو تمام بڑے شہروں میں تبلیغ کے لیے بھیجا؛ چنانچہ چار پانچ سال کی مسلسل کوشش سے شوال ۳۵ ھ میں پندرہ سو سبائیوں نے امام مظلوم حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور چالیس دن تک محاصرہ جاری رکھنے کے بعد ۱۸ ذی الحجہ ۳۵ ھ کو انہیں نہایت بیدردی کے ساتھ شہید کر دیا۔

۳۱۷ ھ میں انہی سبائیوں نے مکہ مکرمہ فتح کر لیا — محض اس لیے کہ فرقہ بندی کی وجہ سے مسلمانوں میں فتنہ بھی پیدا ہو چکا تھا اور ان کی ہوا بھی اُکھڑ چکی تھی — اسلام کے ان مبلغوں نے حجرِ اسود اُکھیڑ لیا اور اپنے امام کے مکان کی دہلیز میں نصب کر دیا تاکہ آیندگان و روندگان اسے پامال کرتے رہیں۔ سلاطینِ بغداد اس قدر ضعیف اور بے حیا ہو چکے تھے کہ وہ بزورِ شمشیر، حجرِ اسود، ان سبائیوں سے (جو تاریخ میں قرامطہ کے نام سے مشہور ہیں) واپس نہ لے سکے۔ ایک بے غیرت سُلطان نے کئی لاکھ دینار بطور رشوت پیش کیے مگر قرامطہ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ۱۴، ۱۵ سال کے بعد اُنہوں نے اپنے امام کے

کہنے سے یہ حجرِ اسود — یہ پامال شدہ حجرِ اسود — پھر مسلمانوں کو واپس کر دیا تھا چنانچہ انہوں نے اسے پھر خانۂ کعبہ میں نصب کر دیا۔ یہ سزا ملی مسلمانوں کو اللہ کے صریح حکم کی نافرمانی کی۔ مگر افسوس آنکھ پھر بھی نہ کھلی۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک سُنّی بادشاہ، محمد خدابندہ نے غصّے کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سُنّی علماء نے کہا "اب کچھ نہیں ہو سکتا..... مگر ایک سبائی عالم نے بادشاہ کی دشواری حل کر دی۔ قدرتی طور پر وہ سبائی ہو گیا اس کی سرپرستی میں ایک سبائی عالم یوسف ابن المطہر الحلّی نے اس کے لیے ایک کتاب لکھی "نہج الکرامہ فی معرفۃ الامامۃ" جس میں اہل سنّت کے عقائد کی تردید اور سبائیت کی تائید کی گئی تھی۔ چنانچہ امام اہلسنت حضرت مجدد قرن ہشتم امام ابن تیمیہؒ نے اس کے جواب میں "منہاج السُّنّۃ" چار جلدوں میں لکھی جو بلاشبہ ردّ سبائیت میں بے نظیر اور لاجواب ہے۔ یہ کتاب ۷۱۴ھ میں شائع ہوئی تھی اور ابھی تک عدیم المثال ہے۔

جہانگیر کے عہد میں قاضی نور اللہ شوستری نے آٹھ جلدوں میں "احقاق الحق" لکھی جس کا جواب کشمیر کے ایک عالم دین سُنّی نے لکھا تھا۔

محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں سبائی حکومت میں دخیل ہو چکے تھے اور اپنے مذہب کی تبلیغ میں سرگرم تھے اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ مجدد قرن دوازدہم (المتوفی ۱۱۷۶ھ) نے ردّ سبائیت میں دو معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں۔ پہلی کتاب کا نام "ازالۃ الخلفاء" ہے اور دوسری کا نام "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین" ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت اور اہمیت یہ ہے کہ اس میں شاہ صاحبؒ نے صرف ایک مبحث پر — یعنی تفضیل شیخینؓ پر ۳۲۰ صفحات میں براہین قاطعہ کا انبار لگا دیا ہے جن کے مطالعے کے بعد تفضیل شیخینؓ کے باب میں کسی منصف مزاج خالی الذہن انسان کو کوئی شک یا شبہ نہیں رہتا — اس موضوع پر یہ کتاب پہلی اور آخری کتاب ہے۔ اگر میں اس کتاب کی اہمیت، عظمت اور قدر و قیمت پر کچھ لکھوں تو "چھوٹا منہ بڑی بات" ہو گی۔ خود میرا دل مجھ سے کہے گا "ایاز

قدر خود بشناس" میں یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اِس کتاب کا تعارف صحیح معنی میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری مرحوم لکھ سکتے تھے۔

میں صرف اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ حضرت شاہ صاحبؒ، تفضیل شیخین رضؓ کے اثبات میں اکثر مقامات میں آسمان سے تارے توڑ کر لے آئے ہیں۔ اثباتِ مدّعا کے جتنے طریقے عند العقل ممکن ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اُن سب طریقوں سے استفادہ کیا ہے اور تفضیل شیخین رضؓ کے مسئلے کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اور تصوّف ــ پانچوں زاویۂ نگاہ سے اپنے دعوے کو مبرہن کیا ہے بلکہ اتمام حجت کر دیا ہے۔

میں اس سلسلے میں دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلی بات یہ ہے کہ میں نے لفظی ترجمہ نہیں کیا ہے۔ وہ HIGHLY TECHNICAL یعنی مصطلحات علمیہ سے لبریز ہو جاتا اور عوام اُس سے ہرگز استفادہ نہ کر سکتے کتاب میں بعض بحثیں خود میری فہم سے بالاتر ہیں، کیونکہ میں نہ محدث ہوں نہ فقیہہ میں نے ان بحثوں کا ترجمہ نہیں کیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ طویل احادیث کا خلاصہ مختصر لفظوں میں بیان کر دیا ہے اور بعض دقیق محدثانہ اور فقیہانہ بحثوں کو بھی چھوڑ دیا ہے لیکن نفسِ مضمون اور اثباتِ دعویٰ میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ چھ صفحات کا ترجمہ نہیں کیا ہے کیونکہ اُس بحث سے صرف محدثین اور فقہا استفادہ کر سکتے ہیں۔ میری اور عوام کی فہم سے بالاتر ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ میں اپنی کوتاہی اور نارسائی کا صاف لفظوں میں اعتراف کرتا ہوں۔ اس کتاب کا ترجمہ کرنے کے لیے جس قدر علمیت اور استعداد کی ضرورت ہے وہ مجھ میں مطلق موجود نہیں ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوگا کہ پھر یہ جسارت کیوں کی؟ اس کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ جب علماء اس ناقص ترجمے کو دیکھیں گے تو قدرتی طور پر ان کے دل میں صحیح ترجمہ پیش کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا اور یہی میرا مقصود ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ مجھے اس موضوع سے عشق ہے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ شیخین رضؓ سے عشق ہے۔ کیوں ؟ اس لیے کہ شیخین رضؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور اسلام کی حقانیت پر روشن دلیل ہیں۔ میں انہی (آفتاب و ماہتاب) کی گواہی کی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لایا ہوں اور میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سچے رسول نہ ہوتے — اپنے دعوے میں صادق نہ ہوتے — تو امام الاولیاء حضرت صدیق اکبر جیسے سراپا صداقت اور حضرت فاروق اعظم جیسے سراپا عدالت حضرات ایک غیر صادق مدعیٔ نبوت پر ہرگز ہرگز ایمان نہ لاتے۔

اس کتاب مستطاب میں انہی الامامین الھمامین السعیدین کی تمام صحابۂ کرام پر تفضیل (بزرگی اور عظمت) بدلائل قاہرہ ثابت کی گئی ہے۔ اور میں پھر علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ جو شخص بھی اس کتاب کو خالی الذہن ہو کر پڑھے گا وہ انشاء اللہ تفضیلِ شیخین رضؓ کا معترف ہو جائے گا۔

آخر میں، بصد الحاح و زاری، بارگاہِ ایزدی میں یہ التجا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے مجھے نسبتِ صدیقی اور نسبتِ فاروقی سے کچھ حصہ عطا فرمائے اور مغفرت فرمائے۔

آمین یا رب العالمین

وانا العبد المفتقر الی اللہ

یوسف سلیم چشتی الحسینی

اسرار احمد

مرتبۂ صدّیقیت
اور
سیرتِ صدّیقی رضؓ ، آئینۂ قرآن میں

صدّیق کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے ہمیں لفظ "صدّیق" کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم متعین کر لینا چاہیئے۔

۱ صدّیق کا لغوی مفہوم لغوی اعتبار سے صدّیق، صدق سے فعّیل کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے گویا اس کے لفظی معنی ہوتے: - پیکرِ صدق ووفا ، سراپا راستی اور مجسّم سچائی

سب جانتے ہیں کہ سیرت و اخلاق کے جملہ محاسن میں صدق و راستی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ گویا وہ جملہ اوصافِ حسنہ کی اساس اور اُمّ ہے جبکہ جھوٹ اور کذب کو اُمّ المعائب کا مقام حاصل ہے۔ وہ مشہور واقعہ بھی یقیناً آپ کو معلوم ہوگا کہ ایک شخص نے نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور! مجھ میں بہت سے بڑے بڑے عیب ہیں لیکن میں ان سب کی بیک وقت اصلاح پر قادر نہیں ہوں البتہ ان میں سے کوئی ایک جو آپ فرمائیں میں چھوڑ دونگا اس پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب نوشی اور بدکاری پر بھی ترکِ کذب کو مقدّم رکھا چنانچہ یہی ایک چیز اس کی مکمل اصلاح کا ذریعہ بن گئی۔

صدق اور صادق کا مقام از روئے قرآن قرآن حکیم کے مطالعے سے صدق کی جو عظمت سامنے آتی ہے اور جس گمبھیر معنی اور وسیع مفہوم میں استعمال ہوتا ہے اس کا کسی قدر اندازہ مندرجہ ذیل آیات سے

ہو سکتا ہے۔

۱ ۔ سورہ حجرات کی آیت ۱۵ میں حقیقی مومن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝	مومن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر، پھر شک نہیں کرتے اور جہاد کرتے ہیں اپنی جانوں اور اموال کے ساتھ اللہ کی راہ میں حقیقت میں صرف یہی لوگ سچے ہیں !

گویا از روئے قرآن ' مومن، اور صادق، ہم معنی الفاظ ہیں ۔

۲ ۔ سورہ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں نیکی کے ایک محدود مفہوم کی نفی اور نیکی کا حقیقی اور جامع تصور پیش کرتے ہوئے فرمایا :۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی جانب پھیر دو بلکہ حقیقی نیکی اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، فرشتوں پر، کتابوں پر، اور انبیاء پر، اور دیا اس نے مال اس کی محبوبیت کے علی الرغم رشتہ داروں کو اور یتیموں کو، اور محتاجوں کو اور مسافر کو اور سائلوں کو اور گردنوں (کو آزاد کرانے) میں اور قائم کی نماز اور ادا کی زکوٰۃ اور نبھانے والے اپنے عہد کے جب کہ باہم کوئی معاہدہ کر لیں اور خصوصاً صبر کرنے والے، فاقوں میں تکلیفوں میں

صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ	اور جنگ کے وقت ۔ یہی ہیں وہ
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝	لوگ جو حقیقتاً سچے ہیں اور یہی ہیں صحیح معنوں میں متقی!

گویا از روئے قرآن نیکی، تقویٰ اور سچائی مترادف ہیں۔

۳۔ سورۂ احزاب کی آیت ۲۳ میں سچے مومنوں کی مدح میں فرمایا:۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	اہل ایمان میں وہ جوانمرد بھی ہیں جنہوں
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ	نے سچ کر دکھایا اپنا وہ عہد جو انہوں
فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ	نے اللہ سے کیا تھا ۔ ان میں وہ
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا	بھی ہیں جو اپنی نذر پیش کر چکے
بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِيَ	اور وہ بھی ہیں جو اس کے منتظر
اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ	ہیں (بہر نوع) انہوں نے اس میں

کوئی تبدیلی نہیں کی! تاکہ اللہ بھرپور صلہ دے سچوں کو ان کی سچائی کا۔

اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سورہ مریم (آیت ۵۴) میں جو حضرت اسماعیل کے بارے میں فرمایا

اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ...	یقیناً وہ وعدے کا سچا تھا...

تو یہ کتنی بڑی ستائش اور کیسی عظیم مدح ہے۔

۴۔ سورہ عنکبوت کے آغاز میں اہل ایمان کے لئے اللہ تعالےٰ کے مستقل ضابطۂ ابتلاء آزمائش کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے ابتداءً فرمایا:۔

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ	اللہ یقیناً واضح کر کے رہے گا کہ کون
صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ۔	سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

اور چند ہی آیات کے بعد پردہ بالکل اٹھا دیا اور واضح الفاظ میں فرما دیا:

وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ	اللہ یقیناً کھول کر رکھ دے گا کہ کون
اٰمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ ۝	(واقعتہً) مومن ہیں اور کون (محض) منافق۔

گویا، صادق، مومن ہے اور کاذب، منافق!

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سورۂ توبہ میں منافقین کے مفصل ذکر اور طویل زجر و توبیخ اور لعنت و ملامت کے بعد جب یہ فرمایا کہ :-

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ ٥ (توبہ آیت ۱۱۹)	اے اہل ایمان، اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے زمرے میں شامل ہو جاؤ۔

تو یہ کتنی جامع نصیحت ہے اور نفاق سے بچنے کی کتنی پُر زور تاکید!

"تصدیق بالحسنیٰ"

"صدق اور صادق" کے اس وسیع اور گمبھیر مفہوم کو ذہن میں رکھ کر مزید غور کیجئے تو یہ بات بالکل دو اور دو چار کی طرح یقینی نظر آئے گی کہ جو شخص خود سچا ہو اور جس کا اپنا موقف راستی اور صداقت پر قائم ہو، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ سچائی کا والہ و شیدا نہ ہو یہاں تک کہ کوئی صداقت اس کے سامنے پیش کی جائے اور وہ اسے رد کر دے اس کے بالکل برعکس ایسے شخص میں سچائی اور راستی کے لئے شدید حمیّت پیدا ہو جانی لازمی ہے اور وہ ہر سچائی کو لپک کر قبول کرے گا اور ہر صداقت کی بڑھ کر تصدیق کرے گا اور اس راہ میں وہ نہ اپنی جھوٹی انا کو حائل ہونے دے گا نہ پر خود غلط خودی کو، نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے گا نہ کسی مفاد کو، نہ کسی خطرے کو خاطر میں لائے گا نہ اندیشے کو۔ نہ کسی سے کٹنا اسے گراں معلوم ہو گا نہ کسی سے جُڑنا، نہ کوئی "ترک" اسے بھاری محسوس ہو گا نہ "اختیار" نہ کوئی "امر" کٹھن نظر آئے گا نہ کوئی "نہی"، — بلکہ صدق اور صداقت کے ساتھ اس کا خلوص ان سب مراحل کو آسان بنا دے گا۔ گویا صدیق کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر صداقت کی تصدیق پر ہر دم اور ہر آن آمادہ ہو۔ اور قرآن حکیم کے الفاظ میں "تصدیق بالحسنیٰ" صدیقیت کا وصفِ لازم ہے۔

صدیق کا اصطلاحی مفہوم

چنانچہ علامہ آلوسی صاحب تفسیر روح المعانی جب لفظ "صدّیق" کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ :-

اَلْمُتَقَدِّمُ فِي التَّصْدِيقِ وَ الْمُبَالِغُ فِي الصِّدْقِ	وہ شخص جو تصدیق میں پہل کرے اور خود اپنے اقوال و افعال میں حد

الاخلاصِ فِی الاقوال و الافعال ۔	درجہ سچا اور مخلص ہو!

تو فنی اعتبار سے یقیناً یہ ایک بہت جامع و مانع تعبیر ہے لیکن حقیقت صدیقیت کی اتنی ہی جامع و مانع تعبیر موجود ہے قرآن حکیم کے ان حد درجہ مختصر لیکن انتہائی پُرشکوہ الفاظ میں کہ:۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖ	وہ شخص جو خود بھی صداقت پر قائم رہا اور ہر سچائی کی تصدیق بھی کرتا رہا!
(سورہ زمر آیت ۳۳)	

مرتبۂ صِدّیقیّت

حضرات منعمٌ علیہم کے مراتب چہارگانہ کے پس منظر میں

قرآن حکیم کی روشنی میں مرتبۂ صدّیقیّت کے تعین اور حضراتِ صدّیقین کے اوصاف وخصائص کے تفصیلی مطالعے سے قبل یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ صدّیقیت بھی نبوّت اور رسالت کی طرح قرآن حکیم کی ایک مستقل اصطلاح ہے اور جس طرح نبوّت ایک حقیقتِ معنوی ہے جس کا مصداقِ ظاہری خارج میں ہونا ضروری ہے اسی طرح صدّیقیّت کا مصداقِ خارجی بھی لازمی ہے۔

لهذا اگر کسی کے ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر، ایسا کوئی خیال یا گمان موجود ہو کہ شاید صدّیقیّت ایک بعد کا گھڑا ہوا خطاب یا القاب ہے، جو محض خوش عقیدگی یا حسنِ ظن کی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کو عطا کر دیا گیا تو اسے اس سے تائب ہونا لازم ہے اس لئے کہ یہ ایک مغالطہ ہی نہیں، بہت بڑی گمراہی ہے اور حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یعنی یہ کہ نبوّت اور رسالت کی طرح صدّیقیت اور شہادت بھی قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں اور جس طرح اوّل الذکر کے مصداق خارج میں موجود ہیں

اسی طرح مؤخر الذکر کے مصداق بھی موجود ہیں، بلکہ جیسا کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا، جس طرح مقام نبوت اور مرتبۂ رسالت کا مظہر اتم ہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح مقام صدیقی اور مرتبۂ صدیقیت کا مصداق کامل ہیں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالےٰ عنہ، وارضاہ۔

منعم علیہم کے چار گروہ

اس سلسلے کی اہم ترین آیت سورۂ نساء کی آیت ۶۹ ہے جس میں نوع انسانی کے وہ خوش قسمت افراد جو انعام یافتہ یا منعم علیہم کہلانے کے مستحق ہیں۔ چار گروہوں میں منقسم قرار دیئے گئے ہیں یعنی: انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ فرمایا:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اطاعت کرتا ہے اللہ
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ	اور اس کے رسولؐ کی تو انہیں
اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	معیت حاصل ہوگی ان کی جن
مِنَ النَّبِيّٖنَ وَ	پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاءؑ
الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	صدیقین، شہداء اور صالحین
وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ	اور بہت ہی اچھے ہیں یہ لوگ
اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝	بحیثیت رفیق!

یہ آیۂ مبارکہ اس اعتبار سے انتہائی اہم ہے کہ اس میں سورۂ فاتحہ کے ایک اجمال کی تفصیل ہے اور سورۂ فاتحہ ہماری سب سے بڑی عبادت یعنی نماز کا جزو لازم ہے بلکہ ایک حدیثِ قدسی کی رو سے عینِ نماز ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا خاتمہ ایک دعا پر ہوتا ہے جس میں ہم اپنے رب سے استدعا کرتے ہیں: "اے رب ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش!" اور پھر اس سیدھے راستے کی مزید وضاحت کے ضمن میں عرض کرتے ہیں "ان لوگوں کے راستے کی جن پر تو نے انعام فرمایا ... (الی الآخر)" ——— یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ منعم علیہم لوگ کون ہیں؟ اسی سوال کا جواب ہے جو سورۂ نساء کی محولہ بالا آیت میں دیا گیا ہے یعنی یہ کہ یہ انعام یافتہ لوگ چار گروہوں پر مشتمل ہیں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔

اس آیہ کریمہ سے جہاں منعم علیہم کی چار گروہوں میں تقسیم واضح ہوئی وہیں یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان کے مابین ترتیبِ مراتب کیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ نوع انسانی میں بلند ترین مرتبہ ومقام کے حامل تو، بلا شائبہ ریب وشک حضرات انبیاء ہیں ،علیہم الصلوٰۃ والسلام ۔ ان کے متصلاً بعد مقام اور مرتبہ ہے صدیقین کرام کا، ان کے بعد ہیں حضرات شہداء اور سب سے آخر میں ہیں عام مومنین صالحین رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین ،

گویا اس آیہ کریمہ میں حضرات منعم علیہم کا ذکر مرتبہ ومقام کے اعتبار سے نزولی ترتیب کے ساتھ کیا گیا ہے ۔

نبوّت اور صدّیقیّت

جہاں تک اس حقیقت کا تعلق ہے کہ مرتبۂ صدّیقیّت مقام نبوّت کے متصلاً بعد اور اس کے بہت قریب واقع ہوا ہے تو اس کی شہادت قرآن حکیم کے بہت سے دوسرے مقامات سے بھی حاصل ہوتی ہے مثلاً :

۱ ۔ قرآن حکیم میں حضرت مریم سلامٌ علیہا کو صراحۃً "صدّیقہ" کا خطاب دیا گیا (سورۂ مائدہ آیت ۷۵)

اب اگر ان کے اس مقام اور مرتبہ کو پیش نظر رکھا جائے جو قرآن مجید کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ :

یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ	اے مریم! اللہ نے تجھے چن لیا ہے
اصْطَفٰکِ وَطَھَّرَکِ	اور تجھے پاک کر دیا ہے اور
وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ	تجھے منتخب فرمالیا ہے تمام
الْعٰلَمِیْنَ ۝ (سورہ نساء آیت ۴۲)	جہانوں کی خواتین میں سے ۔

اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ نبوّت کا دروازہ نوعِ انسانی کی صنفِ نازک پر بند رہا ہے تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ بعد از نبوّت افضل ترین مرتبہ صدّیقیّت کا ہے اور اعلیٰ ترین مدارج ومقامات صدّیقین اور صدّیقات کو حاصل ہیں!

۲ ۔ سورۂ یوسف میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے زنداں کے ساتھیوں نے "صدّیق" کہہ کر مخاطب کیا (سورۂ یوسف : آیت ۴۶) اب ظاہر ہے کہ یہاں دو ہی صورتیں ممکن ہیں ۔ یا تو اسے صرف زنداں کے ان ساتھیوں ہی کا کلام قرار دیا جائے اس صورت میں بھی اس عظیم حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ نبی

کی شخصیت کا نمایاں ترین وصف وصدق، ہی ہے اور جن لوگوں پر ابھی نبی کی نبوت منکشف نہیں ہوئی ہوتی وہ اسے «صدیق» ہی قرار دیتے ہیں چنانچہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قبل از اجرائے وحی اہل مکہ نے «الصادق» ہی کا خطاب دیا تھا —— یا دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ زنداں کے ساتھیوں کا کلام اللہ تعالٰی نے اپنے الفاظ میں (گویا) نقل فرمایا ہے۔ اس صورت میں واحد ممکن تاویل یہ ہے کہ اس وقت تک حضرت یوسف علیہ السلام پر وحی نبوت کا اجرا نہیں ہوا تھا اور ابھی آنجناب صرف صدیقیت کے مقام پر فائز تھے —— بہرصورت مقام صدیقیت اور مرتبہ نبوت کا قرب اظہر من الشمس ہے!

۴۔ سورۂ مریم میں اللہ تعالٰی نے اپنے دو جلیل القدر انبیاء یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت ادریس علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا (آیات ۴۱ و ۵۶)

اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا بے شک وہ صدیق نبی تھا!

جس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف یہ کہ مقام صدیقیت اور مرتبہ نبوت ایک دوسرے سے بہت قریب واقع ہوئے ہیں۔ بلکہ صدیقیت نبوت کی تمہید ہے اور نبوت صدیقیت کی اگلی منزل!

صدیقین اور شہداء

منعَم علیہم کے مراتب چہارگانہ میں سے نبوت تو ظاہر ہے کہ ہے ہی خالص وہبی یعنی پہلے بھی صرف ذاتی قابلیت وصلاحیت اور محنت وریاضت سے حاصل نہیں کی جا سکتی تھی بلکہ جسے بھی ملتی تھی خالص عطیۂ الٰہی اور فضل خداوندی ہی کے طور پر ملتی تھی اور اب تو اس کا دروازہ سرے سے ہی بند ہے، البتہ صدیقیت اور شہادت[1] کے مراتب عالیہ پہلے بھی کھلے

---

[1] واضح رہے کہ اس پوری بحث میں شہادت کا لفظ عام معروف معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآن حکیم کی ایک مخصوص اصطلاح کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ عجیب بات ہے کہ پورے قرآن مجید میں کسی ایک مقام پر بھی شہادت کا لفظ خدا کی راہ میں قتل ہونے کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ اور سوائے ایک مقام کے کہیں بھی شہید کے معنی مقتول فی سبیل اللہ نہیں لئے جا سکتے۔ وہ ایک استثنائی مقام سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۴۰ ہے اور یہاں بھی جہاں شہداء کے معنی مقتولین فی سبیل اللہ لینے کی گنجائش ہے وہاں اتنی گنجائش عام اصطلاحی معنوں کی بھی ہے۔ بہرحال اس بحث میں لفظ شہادت اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں مستعمل ہے!

تھے اور اب بھی نہ "مقطوعہ" ہیں نہ "ممنوعہ"، بلکہ مومنین صالحین اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور مزاج شخصی و افتادِ طبعی کی مناسبت سے ان مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں گویا بقول جگر:

؎ پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن!!

یہی وہ حقیقت ہے جو سورۂ حدید کی آیت ۱۹ میں بیان ہوئی ہے اور جس کے بارے میں بہت سا قیل و قال صرف اس لئے ہوا کہ سیاق کلام اور ربط آیات پیش نظر نہیں رہا۔ چنانچہ جب سلسلہ کلام سے صرف نظر کرتے ہوئے نگاہ صرف اس ایک آیت کے الفاظ پر مرتکز ہو گئی کہ:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔	اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر، تو یہی ہیں صدیق اور شہداء اپنے ربّ کے نزدیک۔

تو ایک الجھن پیدا ہو گئی کہ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مومن صدیق اور شہید ہے جبکہ یہ بات بالبداہت غلط معلوم ہوتی ہے چنانچہ اس اشکال کے حل کی کوششیں کی گئیں اور بہت سی آراء اور بے شمار اقوال کا ذخیرہ کتب تفسیر میں جمع ہو گیا حالانکہ اگر سیاق کلام پر نگاہ رکھی جائے تو یہاں کوئی اشکال یا الجھن سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

دراصل اس آیت کے صحیح فہم کے لئے اس سے پہلے کی تین آیات اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنا ضروری ہے وہ ہذا:

آیت نمبر ۱۶ میں اہل ایمان (گویا عام مومنین صالحین) کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ کس تاخیر و تعویق میں پڑ گئے ہو اور کیوں قدم آگے نہیں بڑھاتے؟ اور متنبہ کیا گیا ہے کہ مبادا تم بھی یہود کے مانند ہو جاؤ جن کے دل امتدادِ زمانہ سے سخت ہوتے چلے گئے اور اب ان کی اکثریت فساق و فجار پر مشتمل ہے گویا یہ آیت زجر و تہدید اور تنبیہ و ترہیب پر مشتمل ہے۔

آیت نمبر ۱۷ میں، قرآن حکیم کے عام اسلوب کے مطابق ترغیب و تشویق کا اسلوب ہے اور حوصلہ بندھایا گیا ہے کہ اگر تم اپنے دلوں میں سختی محسوس کرو تب بھی مایوس مت

ہونا۔ اللہ تعالیٰ جس طرح زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد حیاتِ تازہ عطا فرما دیتا ہے اسی طرح تمہاری کشتِ قلوب کو بھی حیاتِ نو عطا فرما دے گا اور تمہارے دلوں کی کھیتی پھر ایمان حقیقی کی ہری بھری فصل سے لہلہا اٹھے گی!

اگلی آیت میں گویا، سلوکِ قرآنی، کی وضاحت کر دی گئی اور اس عمل تزکیہ کی نشاندہی کر دی گئی جس سے کشتِ قلوب میں ایمان کی فصلِ تازہ کی اُمید کی جا سکتی ہے یعنی یہ کہ اگر دلوں کی کھیتی میں تازہ بہار چاہتے ہو تو پہلے اس میں صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کا ہل چلاؤ اور حبِ دنیا اور حبِ مال کی نجاستوں سے دلوں کو پاک کرو اس لئے کہ اصل میں یہی تمہاری ترقی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ اور تمہاری فطری استعدادات کے بروئے کار آنے میں سب سے بڑا مانع ہے۔

بعدہٗ آیت ۱۹ میں واضح فرما دیا کہ اگر یہ مورچہ تم نے سر کر لیا اور یہ منزل طے کر لی تو پھر کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب ترقی کا راستہ بالکل کھلا ہے اور تم اپنی اپنی ہمت اور محنت کے مطابق اور اپنے اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے صدّیقیت یا شہادت کے مراتب عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہو۔

گویا یہاں ربطِ کلام وہی ہے جو سورہ بلد میں۔ وہاں اسی مورچے یا منزل کو ایک دشوار گزار گھاٹی سے تشبیہہ دی گئی ہے اور نہایت تأسف اور حسرت کے پیرائے میں فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ ہم نے انسان کو بے شمار ظاہری اور باطنی استعدادات سے نواز کر دُنیا میں بھیجا۔ چنانچہ اسے "عینین" بھی دیئے اور لِسَانًا وَّشَفَتَیْنِ" بھی اور پھر درجہ بدرجہ نوعی، جبلّی اور فطری ہدایتوں سے بھی نوازا تاآنکہ "هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ" کی منزل بھی طے کرا دی لیکن یہ کم ہمت اور نکھٹو لا اُس گھاٹی میں نہ گھس پایا! جانتے ہو کون سی گھاٹی؟ "کسی گردن کا چھڑا دینا یا کھانا ہی کھلا دینا، قحط کے ایام میں، کسی یتیم کو جو قرابت دار بھی ہو یا مسکین کو جو خاک میں رل رہا ہو!" (کاش کہ کر پاتا وہ اس گھاٹی کو عبور!) اور پھر جو شامل ہوتا ان نفوسِ قدسیہ میں جو ایمان، تواصی بالصبر اور تواصی بالمرحمہ ایسے اوصافِ جلیلہ سے متصف ہیں ——— فرق صرف یہ ہے کہ سورۂ بلد میں درمیان میں کلمہ "ثُمَّ" آگیا جس نے

لہ پنجابی زبان کے ایک شاعر عبداللہ شاکر کی ایک طویل نظم کے ترجیعی بند کے یہ الفاظ اس مضمون کو خوب ادا کرتے ہیں کہ ؎

اوکھی گھاٹی مشکل پینڈا عشق دیاں اسواراں دا!

ربطِ کلام کو واضح کر دیا جبکہ سورۂ حدید میں اس کی جگہ پر صرف حرفِ عطف "و" آیا جس سے ربطِ کلام قدرے مخفی ہو گیا!

بہرحال سورۂ حدید کی آیت ۱۹ سے یہ حقیقت بھی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ثابت ہو گئی کہ "صدیقین" اور "شہداء" قرآن حکیم کی مستقل اصطلاحات ہیں اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ یہی وہ بلند ترین مقامات ہیں جن تک اکتسابًا رسائی ممکن ہے۔

مزاج اور افتادِ طبع کا فرق

اس معاملے میں مزید انشراحِ صدر کیلئے مناسب ہے کہ منعم علیہم کے مراتب چہارگانہ کے باہمی ربط و تعلق کو نفسیاتِ انسانی کی گہرائیوں میں اتر کر سمجھ لیا جائے اور طبائع کے فطری فرق اور مزاج و افتاد اور رجحانِ طبعی اور میلانِ نفسی کے فطری اختلاف کے حوالے سے قرآن حکیم کی ان چار اصطلاحوں کا گہرا فہم حاصل کر لیا جائے۔

ذرا دقتِ نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو تمام انسان مزاجِ شخصی، افتادِ طبعی اور فطری رجحانات و میلانات کے اعتبار سے دو گروہوں میں منقسم نظر آئیں گے:-

ایک[۱] وہ نسبتًا خاموش، تنہائی پسند، ذہین، حساس، سنجیدہ اور متفکر المزاج لوگ جو خارج کی دُنیا سے زیادہ اپنے باطن میں مگن رہتے ہیں اور باہر کی دنیا اور اس کی دلچسپیوں سے زیادہ انہیں خود اپنے ہی دل و دماغ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی محبوب ہوتی ہے گویا وہ "تن کی دنیا" سے کہیں زیادہ "من کی دنیا" کے باسی ہوتے ہیں۔

اور دوسرے[۲] وہ خوش باش، بے فکرے، چست، فعال اور لاابالیانہ طبیعت کے حامل بلکہ نٹ کھٹ قسم کے لوگ جن کی اصل دلچسپی خارج کی دنیا سے ہوتی ہے اور وہ اس میں پوری طرح مصروف اور مگن رہتے ہیں! غور و فکر سوچ بچار اور تفکر و اعتبار سے انہیں طبعًا کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی اس کے برعکس انہیں یا تو کھیل کود کا شوق ہوتا ہے یا سیر و شکار کا یا شہ زوری اور پہلوانی کا!

پہلی قسم کے لوگوں کو نفسیاتِ جدیدہ کی اصطلاح میں ENTRO-VERT کہتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کو EXTRA-VERT فطری طور پر پہلی قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ بہت مضبوط اور ترقی یافتہ (DEVELOPED) ہوتے ہیں جب کہ قوائے عملیہ نسبتًا خوابیدہ DORMANT رہ جاتے ہیں اور اس کے برعکس دوسری

قسم کے لوگوں کے قوائے فکریہ دبے رہ جاتے ہیں جبکہ قوائے عملی پوری شان کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں۔

ان دو کے علاوہ انسانوں کی ایک تیسری قسم جو بہت شاذ ہے، ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کے قوائے فکری بھی نہایت بیدار اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور قوائے عملیہ بھی پورے چاق وچوبند اور کامل نشوونما یافتہ ہوتے ہیں اور ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ انہیں جدید نفسیات کی اصطلاح میں OMNI-VERT کہا جاتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ اصلاً یہی لوگ حاصلِ نوع انسانی ہیں ایسے لوگ اوّل تو ہوتے ہی بہت کم ہیں اور ان میں بھی وہ لوگ تو بالکل معدوم ہی کے حکم میں ہیں جن کے قوائے فکری وعملی میں کامل توازن موجود ہو! غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے بھی کسی میں پہلا رنگ قدرے نمایاں تر ہوتا ہے اور کسی میں دوسرا۔

ان تینوں میں سے اعلیٰ ترین رتبہ تو ظاہر ہے کہ قسم ثالث کے لوگوں کا ہے ان کے بعد نمبر قسم اوّل کے لوگوں کا ہے اس لئے کہ انسان حیوانات سے ممتاز بہرحال اپنے قوائے فکری وعقلی ہی کی بنا پر ہے اور تیسرے درجے میں دوسری قسم کے لوگ ہیں جو فعّال تو اگرچہ بہت ہوتے ہیں لیکن غور وفکر اور سوچ بچار کم کرتے ہیں۔

حضرات منعم علیہم میں سے صدیقین پہلی قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور شہداء دوسری قسم کے۔

حضرات صدّیقین ابتدا ہی سے طبع سلیم کے مالک ہوتے ہیں جو عبارت ہے عقل صحیح اور قلب سلیم دونوں کے مجموعے سے۔ چنانچہ ایک طرف ان کی اخلاقی حس شروع ہی سے زندہ وبیدار ہوتی ہے اور نہ صرف یہ کہ خیر وشر، نیکی وبدی اور ظلم وجور اور عدل وانصاف کا فرق ان پر واضح رہتا ہے بلکہ ان کی طبیعت کا فیصلہ کن میلان جانب خیر اور سمتِ عدل وادائے حقوق ہی میں رہتا ہے اور دوسری طرف ان پر تعقّل وتفکّر کا غلبہ بھی ابتدا ہی سے ہوتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جستجوئے حق اور اکتشاف حقیقت کا ایک زوردار داعیہ ان کے نفوس میں پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جانب ان کی عقلِ سلیم کتاب فطرت اور صحیفہ کائنات کے مطالعے سے حقائق کونیہ کے عین درپے جادستک دیتی ہے تو دوسری جانب انہیں اپنے آئینہ قلب میں حقیقت الحقائق کا دھندلا سا

عکس بھی نظر آنے لگتا ہے ـــــــــــ یہی وجہ ہے کہ جونہی کسی نبی کی دعوت ان کے کانوں میں پڑتی ہے۔ وہ والہانہ لبیک کہتے ہوئے دوڑ پڑتے ہیں اور انہیں بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا! میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا!

اس کے برعکس حضراتِ شہداء کے قلوب و اذہان پر ابتداءً ان کے رجحاناتِ طبعی اور میلاناتِ نفسی کے باعث ایک غلاف سا چڑھا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں نبی کی دعوتِ پر لبیک کہنے میں دیر لگ جاتی ہے۔ یہ تاخیر اصلاً تو صرف بے توجہی اور لاابالی پن کے باعث ہوتی ہے لیکن ان میں سے بعض اپنے آبائی تعصبات کے باعث شروع میں نبی کی مخالفت اور مزاحمت میں حد درجہ سرگرم بھی ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے قلوب و اذہان کا غلاف بھی اکثر و بیشتر کسی عقلی یا استدلالی اپیل سے نہیں بلکہ جذباتی انگیخت ہی سے پھٹتا ہے۔ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی اس غلاف میں شگاف پڑتا ہے گویا سارا فاسد مواد ایک دم خارج ہو جاتا ہے اور دعوت حق کو قبول کرنے کے بعد جب وہ برسرِ عمل ہوتے ہیں تو اپنے فطری جوشِ عمل اور جذبہ کار کے باعث بظاہر صدّیقین پر بھی بازی لے جاتے ہیں اور حضرت مسیحؑ کے ان الفاظ کا مصداقِ کامل بن جاتے ہیں کہ: "کتنے ہی ہیں جو بعد میں آتے ہیں لیکن اگلوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں!" ـــــ یہ عرض کرنا تحصیلِ حاصل ہے کہ فرائضِ رسالت کی ادائیگی میں کم از کم بظاہر احوال حضراتِ شہداء ہی انبیاء کرام کے اصل دست و بازو نظر آتے ہیں۔

کبار صحابہؓ میں سے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ صدیقیت کاملہ کی نہایت درخشاں مثالیں ہیں اور حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہؓ طبقہ شہداء کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں!

جہاں تک حضرات منعم علیہم کے چوتھے گروہ کا تعلق ہے۔ یعنی حضراتِ صالحین تو یہ وہ عامۃ المومنین ہیں جن میں استعداد اور صلاحیت تو موجود ہوتی ہے لیکن ابھی اُس کا کوئی نمایاں ظہور کسی خاص رُخ پر نہیں ہوا ہوتا۔ مزاج اور افتادِ طبع کے اعتبار سے اُن میں پہلی دونوں ہی قسموں کے لوگ موجود ہوتے ہیں گویا ان میں بالقوہ[۵۵] تو صدّیقین بھی ہوتے ہیں اور شہداء بھی ہوتے ہیں۔ لیکن بھی وہ ترفع انہیں بالفعل (ACTUALLY) حاصل نہیں ہوا ہوتا البتہ اگر وہ اپنی ہمت کو مجتمع کر کے محنت کریں اور خصوصاً حبِ دُنیا کی نجاست سے اپنے دل کو پاک کرلیں

جس کا سب سے بڑا علم اور نشان (SYMBOL) حبِّ مال ہے تو جیسا کہ سورہ حدید کی آیات ۱۶ تا ۱۹، اور سورہ بلد کے حوالے سے مفصّل بیان کیا جا چکا ہے وہ اپنے مزاج اور افتادِ طبع کی مناسبت سے صدیقیّت یا شہادت کے مراتبِ عالیہ تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی جن لوگوں کو بالفعل ترفّع حاصل ہو جاتا ہے وہ اگر قسم اوّل سے تعلق رکھتے ہوں تو زمرۂ صدیقین میں شامل ہو جاتے ہیں اور اگر طبقۂ ثانیہ سے ہوں تو حلقۂ شہداء میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یہاں ضمنی طور پر یہ بھی سمجھ لیا جائے تو اچھا ہے کہ اہلِ تصوّف کی اصطلاح میں پہلی قسم کے لوگ سالک مجذوب کہلاتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ مجذوب سالک!

رہے انبیاء کرام تو اگرچہ نبوّت ایک خالص وہبی اور عطائی ملکہ ہے اور اللہ جسے چاہے یہ نعمتِ عظمیٰ عطا فرما دے تاہم بفحوائے آیہ قرآنی "اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ" (سورۂ انعام آیت ۱۲۴: اللہ بہتر جانتا ہے کہاں رکھے اپنی رسالت!) ان کا انتخاب قسم ثالث کے لوگوں ہی میں سے ہوتا ہے جن کی عقلی و فکری قوتیں بھی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی ہوتی ہیں اور فعل و عمل کی قوّتیں بھی پورے جوبن پر ہوتی ہیں اور پھر ان دونوں کے مابین ایک حسین توازن بھی موجود ہوتا ہے۔ گویا ہر نبی اپنے مزاج کے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے صدّیق بھی ہوتا ہے اور شہید بھی۔ اگرچہ ان دونوں اجزائے ترکیبی کی کسی ذاتِ واحد میں بیک وقت بتمام و کمال موجودگی حد درجہ شاذ بلکہ حقیقتاً کالمعدوم کے حکم میں ہے۔ چنانچہ جن انبیاء و رُسل کے حالات تفصیل سے معلوم ہیں ان میں ان دونوں قوّتوں کی بیک وقت بتمام و کمال موجودگی اور پھر ان کے مابین کامل توازن کی مثال تو ایک ہی ہے اور وہ ہے ذاتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ باقی حضرات بھی اگرچہ اپنے اپنے مقام پر نہایت جامع الصفات شخصیتوں کے مالک ہیں۔ تاہم کسی میں رنگِ صدیقیت نمایاں تر ہے جیسے حضرت ادریس، حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف اور کسی میں رنگِ شہادت زیادہ نمایاں تھے۔ جیسے حضرت نوح، حضرت اسمٰعیل اور حضرت موسیٰ علیٰ نبیّنا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام۔

نبوّت و رسالت

یہاں اس حقیقت کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ نبوّت اور رسالت دو مختلف یا علیحدہ چیزیں نہیں ہیں

بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ یہ بات تو صد فی صد درست ہے کہ نبوت عام ہے اور رسالت خاص۔ یعنی ہر رسول تو لازماً نبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر نبی لازماً رسول نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ حقیقت بھی صد فی صد صحیح ہے کہ منکرین اور مخالفین پر فیصلہ کن غلبے کا وعدہ بھی صرف رسولوں سے ہے انبیاء سے نہیں۔ لیکن جس کسی نے یہ سمجھا ہے کہ رسالت مرتبہ و مقام کے اعتبار سے نبوت سے بلند تر ہے اسے یقیناً مغالطہ ہوا ہے۔

نبوّت اور رسالت کے باہمی تعلق کو سرسری طور پر تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ نبوّت ایک حیثیت یا رُتبہ ؎۲ ہے اور رسالت ایک عہدہ یا منصب (POSITION OR APPOINTMENT) ہے۔ جیسے مثال کے طور پر سی ایس پی ایک حیثیت یا رتبہ ہے اور کسی ضلع کی ڈپٹی کمشنری ایک عہدہ یا منصب ہے۔ جس کسی نے سی ایس پی کا امتحان پاس کر لیا اس کی ایک حیثیت متعین ہو گئی یہ مثال ہے نبوّت کی۔ اور جب اس کی تعیناتی کسی ضلع کے ڈی سی کی حیثیت سے ہو گئی تو یہ ایک منصب ہے جو اسے ملا۔ یہ مثال ہے رسالت کی ؎۱ اب ظاہر ہے کہ اصل اعتبار حیثیت کا ہے جو مستقل ہے نہ کہ منصب کا جو بدل بھی سکتا ہے۔

اور اگر اسی حقیقت کو مزید گہرائی میں سمجھنا ہو تو اہل تصوّف کی اصطلاحات سے مدد لینی ہوگی نبوّت مرتبہ عروج میں ہے سیر الی اللہ اور سیر فی اللہ دونوں کو جبکہ رسالت مرتبہ نزول میں ہے اور عبارت ہے سیر من اللہ الی اللہ سے۔ گویا نبوّت کا اصل رُخ خدا کی جانب ہے اور یہ معراج ہے حیثیت عبدیت کی اور اس کے متصل واقع ہے مقام صدیقیت جب کہ رسالت کا اصل رُخ خلق کی جانب ہے اور اس کے قریب تر ہے مرتبہ شہادت — مزید واضح الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صدیقیت ظلّ ہے مقام نبوّت کا اور شہادت ظلّ ہے مرتبہ رسالت کا!

رسالت اور شہادت

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں رسالت اور شہادت کا ذکر اکثر لازم و ملزوم کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

؎۱ یہی رمز ہے سورہ احزاب کی اس مشہور آیت کے اسلوب خطاب میں کہ "یَا أَیُّهَا النَّبِیُّ إِنَّا أَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا" - (الی آخر الآیۃ)

؎۲ (CLASS OR CADER)

جیسے :-

۱ - اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَیْکُمْ (سورہ مزمل)	ہم نے بھیج دیا ہے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر۔
۲ - اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا (سورۂ احزاب)	ہم نے بھیجا ہے تمہیں گواہ بنا کر۔
۳ - لِیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْکُمْ (الحج)	تاکہ ہو جائے رسول گواہ تم پر !
۴ - وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا (سورۂ بقرہ)	اور ہو جائے رسول تم پر گواہ !

گویا بعثت رسل کی اصل غرض و غایت بھی شہادت ہے اور کار رسالت کی نسبت باطنی بھی شہادت ہی کی جانب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا، فرائض رسالت کی ادائیگی میں انبیاء کرام کے اصل دست و بازو حضرات شہداء ہی بنتے ہیں۔

اور یہیں سے سمجھ میں آسکتا ہے تفسیر و تاویل قرآن کا وہ غامض نکتہ کہ کیوں سورۂ مریم میں دو جلیل القدر انبیاء کو تو، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا "صِدِّیقًا نَّبِیًّا"، قرار دیا گیا اور دو وہی کو "رَسُوْلًا نَّبِیًّا"، کہا گیا۔ قرآن حکیم میں کوئی لفظ بے معنی نہیں اور کوئی ترکیب خالی از حکمت نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم ہی سرسری طور پر گزر جائیں اور وہ علاج تنگیٔ داماں" سے صرف نظر کر کے صرف دو چند کلیوں پر قناعت" کی روش اختیار کر لیں۔ بات بالکل واضح ہے کہ جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے مزاج میں رنگ صدیقیت نمایاں ہے گویا ان کا انتخاب صدیقین کے زمرے میں سے ہوا تھا لہذا وہ صدیقاً نبیاً قرار پائے اور حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے مزاج میں رنگ شہادت نمایاں تر ہے جو اقرب اور انسب ہے مرتبہ رسالت سے پس وہ رسولاً نبیاً قرار پائے گویا ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیو ! جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

فہرست تصانیف

ڈاکٹر اسرار احمد

- تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ ۶/-
- مطالبات دین ۶/-
- اسلام کی نشاۃ ثانیہ : کرنے کا اصل کام ۱/-
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ۳/-
- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں ۱/۵۰
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (اردو) ۲/-
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (انگریزی) ۳/-
- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (عربی) ۳/-
- مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ اول ۵/-
- مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ دوم ۵/-
- قرآن اور اس عالم ۷۵/-
- راہ نجات : سورۂ والعصر کی روشنی میں ۲/--
- علامہ اقبال اور ہم ۱۰/۵۰
- عظمت صوم ۷۵/-
- دعوت الی اللہ ۱/--
- آیت الکرسی ۳۰/-
- قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ :
  الفاتحہ تا الکہف ۳/-

Regd. L. No. 736

Monthly MEESAQ Lahore

Volm. 28 | JAN., FEB. 1979 | No. 1-2

ماہ ربیع الاول کا بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ایک اہم خطاب

نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں

ترتیب و تسوید

شیخ جمیل الرحمٰن

قیمت فی نسخہ ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

(نوٹ : تبلیغی مقاصد کے لیے کم از کم ایک صد کی تعداد میں منگوانے پر ایک روپیہ فی نسخہ دیا جائے گا اور محصولڈاک بھی انجمن برداشت کرے گی)

شائع کردہ :

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہ